"منطق الطیر جدید" میں صوفیانہ عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

سلطان محمود

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۱۹ء

"منطق الطیر جدید" میں صوفیانہ عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ نگار:

سلطان محمود

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۱۹ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

پیش کار: سلطان محمود رجسٹریشن نمبر: 1378/M/U/F17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر محمود الحسن _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ_____

اقرار نامہ

میں، سلطان محمود حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم۔ فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

سلطان محمود

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم III

اقرار نامہ IV

فہرستِ ابواب V

Abstract VIII

اظہار تشکر IX

باب اوّل: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید:

i. موضوع کا تعارف ۱

ii. بیان مسئلہ ۱

iii. مقاصد تحقیق ۲

iv. تحقیقی سوالات ۲

v. نظری دائرہ کار ۲

vi. تحقیقی طریقہ کار ۳

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق ۳

viii. تحدید ۳

ix. پس منظری مطالعہ ۳

x. تحقیق کی اہمیت ۳

ب: علم تصوف ۴

ج: تصوف لغوی و اصطلاحی مباحث ۶

د: اردو ناول میں تصوف کی روایت ۱۴

	ہ: فرید الدین عطار: اجمالی تعارف	۲۷
	و: مستنصر حسین تارڑ : اجمالی تعارف	۳۳
	ز: مثنوی منطق الطیر اور ناول منطق الطیر جدید میں مماثلتیں	۴۴
	حوالہ جات	۴۹
باب دوم	**منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر غیر الہامی مذاہب کے حوالے سے**	۵۱
	الف: بدھ مت کے حوالے سے	۵۱
	ب: ہندو مت کے حوالے سے	۶۳
	ج: سکھ مت کے حوالے سے	۸۷
	حوالہ جات	۱۰۵
باب سوم:	**منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر الہامی مذاہب کے حوالے سے**	۱۰۸
	الف: یہودیت کے حوالے سے	۱۰۸
	ب: عیسائیت کے حوالے سے	۱۲۹
	ج: اسلام کے حوالے سے	۱۴۱
	حوالہ جات	۱۵۹
باب چہارم	**مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات**	۱۶۱
	i. **مجموعی جائزہ**	۱۶۱
	ii. **نتائج**	۱۶۹
	iii. **سفارشات**	۱۷۰
	iv. کتابیات	۱۷۱

Abstract

The historical novel began to appear in the earliest period of Urdu work of fiction. The mystic characters, both positive and negative were being presented in historical novel. Since mysticism is a natural process of human thinking it has become a universal truth and reality. It has saturated in all the religions of the world too. In fact mysticism is the spiritual angle of every society and culture. It provides insight to each and every religion. Various writers of Urdu language have made mystic aspects as their subject matter in novel. The list of these famous persons includes a valuable name of Mustansar Hussain Tarar.

The title of my M.phil thesis is **"The Critical and Exploratory study of the Mystical elements in the *Mantiq-At-Tair Jadeed***". In this novel, Mustansar Hussain Tarar has narrated the mystic elements in heavenly and non- heavenly religions in a unique and interesting manner. The novel, Mantiq-At-Tair jadeed is a sequel of an epic written by Khwaja Farid-Ud-Din Attar. Basically Mustansar Hussain Tarar is impressed by Khawaja Farid-ud-Din Attar. He admits him as his spiritual teacher. Following his footsteps, he has described mystic traditions through birds. He has pinpointed Buddha's mystic life. Similarly he highlights the mystic aspects of Hinduism and Sikhism with respect to Gorakhnath, Hari Bharthari, Jogi Pooran and Guru Nanak. It is observed that these religions also have self denial, stoicism, search for truth and different kinds of exercises such asceticism, meditation and Yoga etc. While the mystic elements found in heavenly religions such as in Jewish, Christianity and Islam has been highlighted through birds. In this novel too, the writer has made us travel from worldly love to divine love by disclosing the secrets of knowledge of God and difference between vice, virtue and ecstasy.

اظہار تشکر

اس مقالے کی تکمیل کے لیے خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا اور بے حد شکر گزاری واجب ہے جس ذات کے خاص کرم کی بدولت یہ کام بروقت پایہ تکمیل تک پہنچا۔ بے حد و بے شمار درود و سلام حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین کی ذات اقدس پہ، جن کی محبت مسلمانوں کا فخر اور اثاثہ ہے۔ ازاں بعد شکریہ واجب ہے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کی صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عابد سیال، رابطہ کار ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور واجب التکریم اساتذہ کرام کا، جن کی شفقت و محبت ہر لمحہ مجھے میسر رہی اور جن کی علمی قابلیت، پیشے سے لگن اور وابستگی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ خاص طور پہ نگران مقالہ ڈاکٹر محمود الحسن کا انتہائی ممنون اور شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے ابتدا سے اب تک ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، ہر ہر مرحلے پر ان کی شفقت و رہنمائی میرے شاملِ حال رہی اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ میری مدد اور مشفقانہ رہنمائی کے لیے موجود اور دستیاب رہے۔ چاہے وہ موضوع کا انتخاب ہو، خاکہ کی تیاری ہو، مواد کا حصول ہو یا دیگر فنی و تکنیکی باریکیاں۔ ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی بدولت یہ تمام مراحل آسانی سے طے ہوئے۔ والدین کی دعائیں ان تمام مراحل میں میرے ساتھ رہیں جن کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ میری والدہ کی دلی خواہش تھی کہ میں اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے جاری رکھوں۔ اِس کے ساتھ ساتھ میرے والدِ گرامی قاضی کپور حسین جو کہ خود محکمہ تعلیم کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں، اُن کی شفقت اور رہنمائی ہمہ وقت میرے ساتھ رہی۔ اللہ تعالیٰ والدین کا سایہ تا دیر ہمارے سر پہ رکھے۔ امین۔ ساتھی اسکالرز محمد عرفان، محمد حنیف، محمد جمیل اور محمد زبیر سمیت میں تمام دوست احباب کا شکر گزار ہوں جن کے قیمتی مشورے، نیک خواہشات اور رہنمائی مجھے میسر رہی۔ اپنے بڑے بھائی قاضی مظہر آفتاب کا بھی انتہائی مشکور ہوں کہ جنہوں نے ہر مشکل گھڑی میں میرے ساتھ خصوصی تعاون فرمایا، اللہ تعالیٰ اُن کو صحتِ کاملہ اور عمر دراز نصیب عطا فرمائے۔ آمین

اپنی شریک حیات کا اور اپنی بہنوں کا بھی شکریہ ادا کروں گا کہ جنہوں نے یکسوئی سے کام کرنے کے لیے ماحول فراہم کیا اور دیگر مصروفیات سے بری الذمہ کیا اور میرے کام کے حوالے سے مجھے تحریک دی تاکہ میں جلد از جلد اپنا کام مکمل کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ تمام کو جزائے خیر دے۔ امین

سلطان محمود
اسکالر ایم۔ فل اُردو

باب اوّل

فرید الدین عطار کی مثنوی "منطق الطیر" اور مستنصر حسین تارڑ کے ناول " منطق الطیر جدید" کا تقابل

(الف) تمہید

i. موضوع کا تعارف:

تاریخی نالوں کے آثار اردو ناول نگاری کے پہلے دور میں ہی نمودار ہو گئے تھے تاریخی ناولوں میں متصوفانہ کردار مثبت یا منفی دونوں حوالوں سے پیش ہوئے ہیں۔ تصوف فکر انسانی کا ایک خود کار نتیجہ ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ایک عالمگیر حقیقت اور سچائی بن کر سبھی ادیان عالم کے ظاہر و باطن میں مصروف عمل ہے۔ صوفی ازم دنیا کے ہر سماج اور تہذیب کا روحانی زاویہ ہے اور یہ ہر مذہب کا وجدانی پہلو ہے۔ اردو ناول نگاری میں کئی ادیبوں نے صوفیانہ پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے۔ ان نامور لوگوں کی فہرست میں ایک نمایاں اور قابل قدر نام مستنصر حسین تارڑ کا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ایک نامور ناول نگار، سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، کالم نگار، طنز و مزاح نگار، سیاح، دانشور، ٹی وی میزبان اور ادیب ہیں۔ معروف ادبی شخصیت مستنصر حسین تارڑ نے جہاں باقی اصناف ادب میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ان میں ایک صنف ناول بھی شامل ہے۔ جس طرح ان کے سفر ناموں اور افسانوں کو پذیرائی ملی اسی طرح ان کی ناول نگاری کو قارئین اور ناقدین نے سراہا۔ ان مشہور ناولوں میں سے ایک ناول منطق الطر جدید شامل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ایک ایسی باکمال شخصیت ہیں جو کبھی بھی ایک منزل پر پہنچ کر نہیں تھکتے۔ اردو ادب کے ساتھ ساتھ انھوں نے دیگر زبانوں میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ انھوں نے انگریزی زبان میں بھی افسانے اور پنجابی زبان میں بھی طبع آزمائی کی۔ مستنصر حسین تارڑ کا لکھنے کا انداز باقی ادباء سے منفرد اور مختلف ہے۔ تارڑ اپنی تحریر میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہیں جس سے قارئین کافی محظوظ ہوتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو حقیقی دُنیا میں موجود پاتے ہیں۔

ii. ۔بیان مسئلہ:

مستنصر حسین تارڑ نے سفر ناموں کے بعد جس صنف کی طرف خصوصی توجہ دی وہ بلا شبہ ناول ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اردو زبان کے علاوہ پنجابی زبان میں ناول نویسی کی۔ ان کے ناول متنوع

موضوعات سمیٹے ہوئے ہیں۔ان کے ناولوں کے اندر مختلف تہذیبوں کی کمال مہارت سے عکاسی کی گئی ہے۔ان کے مشہور ناولوں میں پیار کا پہلا شہر،راکھ،بہاؤ،جپسی اور قلعہ جنگی قابل ذکر ہیں۔مستنصر حسین تارڑ کو ناول نگاری پر کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ان کے ناولوں کے کئی دوسری زبانوں میں تراجم کیے گئے۔ان کے کئی ناول عالمی شہرت کے حامل ہیں۔ناول منطق الطیر جدید موضوع کے حوالے سے منفرد ہے اور اردو ادب میں خوبصورت اضافہ ہے۔انھوں نے اس ناول میں الہامی اور غیر الہامی مذاہب کا تذکرہ کرتے ہوئے تصوف اور صوفیانہ عناصر کو زیر بحث لایا ہے۔مجوزہ تحقیقی منصوبہ اس ناول کے صوفیانہ عناصر کے مطالعہ پر مبنی ہو گا۔

iii۔مقاصد تحقیق:

(الف)فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر اور مستنصر حسین تارڑ کے ناول منطق الطیر جدید میں اشتراکات واختلافات تلاش کرنا۔

(ب)منطق الطیر جدید میں غیر الہامی مذاہب کے حوالے سے صوفیانہ عناصر کا تجزیہ کرنا۔

(ج) منطق الطیر جدید میں الہامی مذاہب کے حوالے سے صوفیانہ عناصر کا تجزیہ کرنا

iv۔ تحقیقی سوالات:

(الف)کیا مستنصر حسین تارڑ کا ناول منطق الطیر جدید فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا تسلسل ہے؟

(ب)منطق الطیر جدید میں غیر الہامی مذاہب کے صوفیانہ عناصر کے پہلوؤں کو کیسے واضح کیا گیا ہے؟

(ج) منطق الطیر جدید میں الہامی مذاہب کے حوالے سے کون کون سے صوفیانہ عناصر بیان کیے گئے ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار:

صوفیاء کی وعظ و نصیحت سے قلبِ انسانی میں پیدا ہونے والے مثبت اور تعمیری انقلاب کو بھی کئی ناولوں کا موضوع بنایا گیا۔ صوفیا کا تصوف ایک قدیم موضوع ہے لیکن داستانوں سے لے کر جدید اردو ناول تک یہ نظریہ کسی نہ کسی صورت میں ادب کا حصہ نظر آتا ہے۔ متصوفانہ افکار اور کردار نگاری کی نمائندہ ناولوں جیسے ''الکھ نگری''اور ''پیر کامل'' میں بھی متصوفانہ افکار کو بیان کیا گیا ہے۔ وہی پر حال ہی شائع ہونے والا ناول ''منطق الطیر جدید ہے۔ جو کہ صوفیانہ عناصر کی عکاسی کرتا ہے۔ مجوزہ تحقیقی کام مستنصر حسین تارڑ کا ناول، منطق الطیر جدید کا تحقیقی پہلوؤں سے تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ تحقیقی کام کے لیے دستاویزی طریقہ تحقیق اپناتے ہوئے بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ تاریخی و تنقیدی کتب سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ بوقت ضرورت دیگر طریقہ ہائے تحقیق کو بھی اختیار کیا جاسکے گا۔ مطبوعہ و غیر مطبوعہ مواد کی جمع آوری کی جائے گی۔ سرکاری، جامعاتی و نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا جائے گا۔ انسائیکلو پیڈیا، انٹرنیٹ، پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا، انٹرویوز، کانفرنس، سیمینار، تحقیقی رسائل و جرائد و دیگر دستاویزات سے استفادہ کیا جائے گا۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

مستنصر حسین تارڑ کا ناول منطق الطیر جدید حال ہی میں شائع ہونے والا ناول ہے اور اس پر ابھی تک کوئی تحقیقی کام انفرادی اور جامعاتی سطح پر نہیں ہوا ہے۔

viii۔ تحدید

ناول نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں کی فہرست کافی طویل ہے مگر مجوزہ تحقیقی مقالہ حال ہی میں شائع ہونے والے ناول منطق الطیر جدید کے مطالعہ پر مبنی ہو گا۔ اس میں بھی فنی و دیگر پہلوؤں کے بجائے صوفیانہ عناصر کے مطالعہ تک محدود رہے گا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

مجوزہ تحقیق مستنصر حسین تارڑ کا ناول منطق الطیر جدید کے مطالعے کے حوالے سے ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی خدمات پہ جامعاتی سطح کے ساتھ ساتھ انفرادی طور پہ بھی بہت کام کیا جا چکا ہے۔ اس حوالے سے کیا گیا تحقیقی و تنقیدی کام میرے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں صوفیانہ عناصر اور اسی موضوع پہ لکھی گئی دیگر کتب بھی زیر مطالعہ رہی ہیں۔ جن میں ڈاکٹر رضا احمد کی کتاب "اُردو ناول میں تصوف کی روایت" ڈاکٹر غلام قادر لون کی کتاب "مطالعہ تصوف" مترجم حکیم مطیع الرحمن "حکایاتِ فریدالدین عطار" اور عماد الحسن کی کتاب "دُنیا کے بڑے مذاہب" شامل ہیں۔

x ۔ تحقیق کی اہمیت

مستنصر حسین تارڑ نامور ادیب اور لکھاری ہیں۔ اسی ناطے سے ان پہ بہت زیادہ کام ہو چکا ہے اور کئی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن ناول منطق الطیر جدید حال ہی میں شائع ہونے والا ناول ہے اور اس پر ابھی تک

کوئی تحقیقی کام انفرادی اور جامعاتی سطح پر نہیں ہوا ہے چونکہ اردو میں ناول نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے اور مستنصر حسین تارڑ کا ناول منطق الطیر جدید متصوفانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کو ناول نگاری کے حوالے سے کئی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ان کے معاصرین اور ناقدین کے ساتھ ساتھ قارئین بھی ان کی ناول نگاری کی عظمت کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے ناول جیسی صنف میں جہاں پلاٹ ،مکالمے ،منظر کشی اور کرداروں پہ محنت کی ہے وہیں پر انھوں نے اچھوتے اور منفرد موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ان کے ناول منطق الطیر جدید میں مختلف مذاہب کے حوالے سے صوفی ازم اور تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔۔ان کے ناول کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں انھوں نے مختلف مذاہب کے نظریات کو بیان کیا ہے وہیں پر انھوں نے صوفیانہ عناصر کی عکاسی کی ہے۔اس لحاظ سے مستنصر حسین تارڑ کے ناول منطق الطیر جدید کا تحقیقی مطالعہ بہت ضروری ہو جاتا ہے تا کہ ان کے کام کو ادبی دنیا کے سامنے لایا جا سکے۔اس حوالے سے یہ تحقیقی کام بہت اہمیت کا حامل ہو گا۔

(ب) علم تصوف:

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں بسنے والے مسلمانوں نے اپنی اصلاح کے لیے صوفیاء کرام کی خدمات سے استفادہ کیا۔ صوفیاء کرام نے اپنی اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھایا۔ "طلب اور رسد" کے قوانین کو مد نظر رکھتے ہوئے اور عوام کی اصلاح کے لئے کامل صوفیاء کرام نے اپنی نگاہ اور قلم کا درست استعمال کرتے ہوئے ہمارے دلوں و دماغ کو منور کیا۔ صوفیاء کرام کے قلم کی روشنائی تصوف کی تاریخ کو روشن کرتی گئی اور یہ روشنی منظم انداز سے ترتیب پاتے پاتے مختلف کتب ورسائل کی شکل میں ظاہر ہوتی رہی۔ مختلف مشاہدات اور تجربات عوام تک پہنچتے رہے۔ شوق کی تکمیل اور جستجو کو منزل کی طرف گامزن کرنے کے لئے صوفیاء کرام کے دروازے ہمشہ عوام کے لئے کھُلے رہتے تھے۔ جہاں پر ہدایت کی جانب رہنمائی ہر وقت دستیاب رہتی۔ علم کی پرکھ، تحقیق، تجربات اور مشاہدات کے ذریعے کی جاتی پھر ان نازک اور پر جمال نکات کو عوام کی رہنمائی کے لئے احاطہ تحریر میں لایا جاتا تھا۔ صوفیاء کرام کی حیات مبارکہ پر زیادہ کام ہوا ہے، جبکہ اُن کی سوچ، فکر اور تعلیمات پر نسبتاً بہت کم کام ہوا ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے ہمیشہ مشاہدہ و تحقیق، تجربات اور عمل کی بات کی ہے لیکن ہم لوگ عمل و تحقیق میں کافی پیچھے ہیں اور ابھی تک اس طرف مائل نہیں ہوئے۔

ہم ہمیشہ مختصر راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ کم محنت سے شہرت اور کامیابی حاصل کرنا ہمارا شیوہ ہے۔ دوسری صورت میں صوفیاء کرام عالم با عمل ہوتے ہیں اور وہ دعوت بھی تحقیق و عمل کی ہی دیتے ہیں۔ اگر ہم علم تصوف کی ہی بات کریں تو ہمیں اس چیز کا بخوبی اندازہ ہو گا اور یہ احساس ہو گا کہ ہم اپنے آباواجداد سے کس قدر دور ہیں۔ علم تصوف جو کہ کافی تگ ودو، تحقیق اور مشاہدہ کے بعد سمجھ میں آتا ہے ہم اس پر بھی بغیر مشاہدے اور تحقیق کے اپنی رائے ٹھوس دیتے ہیں۔ صوفیاء کا شمار اُن عظیم برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے کہ جن کے پاس عیش و عشرت کے لئے ڈھیر سارا سامان مہیا نہیں ہوتا اور نہ ان کے پاس کوئی عظیم سلطنت، سرکاری عہدہ ہوتا ہے بلکہ وہ بعض اوقات وہ عام لوگوں سے بھی زیادہ تنگ دست ہوتے ہے۔ انسان کے دل ودماغ پر حکومت کرنے والے ان لوگوں کے لاکھوں عقیدت مند اور چاہنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی بے باکی اور فہم و فراست کو بڑے بڑے فرعون صفت بادشاہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ صوفیاء کرام میں اشاعت دین اور اپنے مذہب سے لگاؤ بہت زیادہ ہوتا ہے، ان کی تعلیمات سے ایثار ومحبت، اخوت سے محمور زندگی کا درس ملتا ہے۔ تاریخ مذہب کے بعض ماہرین ان نظریات کے حامی ہیں کہ تصوف ہر مذہب کا یا کہ روحانی کیفیات کا ایک ایسا خودکار عمل ہے جو کہ مذہب کے اہم اور مخصوص مقام پر پہنچنے کے بعد خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔ عام معاشرتی رویوں اور تاریخ کے مطالعہ سے اس تمام تر صورت حال کی جو سب سے خاص وجہ نظر آتی ہے کہ جب کوئی مذہب اپنی اصل پہچان اور اصل روح کے بجائے صرف ادائیگی فرائض کا نام بن کر رہ جاتا ہے تو چند لوگ ایسی صورت حال میں اپنے مذہب کو اس کی اپنی اصل روحانی پاکیزگی اور باطنی شدت کے ساتھ اپنی زندگی میں نافذ العمل کر لیتے ہیں اُن کا یہی فعل اور عمل متصوفانہ عقائد و نظریات کا آغاز بن کر رہ جاتا ہے۔ تصوف کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات باور ہوتی ہے کہ تصوف کا وجود صرف مذہب اسلام سے وابستہ نہیں بلکہ سبھی ادیان اور سبھی مذہبی عقائد و نظریات تصوف اور متصوفانہ افکار و اعمال ایک باہم متشابہ صورت حال کی پیداوار محسوس ہوتے ہیں۔ اہل تصوف بزرگان دین نے ہر دور میں صالح معاشرے کی بنیاد قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور لوگوں کو بھی پرامن اور سلامتی سے رہنے کی تلقین کی۔ صوفیاء نے عالمگیر اخوت کو فروغ دیا اور ہمیشہ بھائی چارے کا درس دیا اور لوگوں میں تفریق کو ہوا دینے کے بجائے خلوص نیت اور محبت کے چراغ ہر جگہ روشن کیے۔ صوفیاء نے اپنے کردار، احسن اخلاق اور اعلی ظرفی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ایسے ایسے مردہ دلوں کو نئی زندگی جیسی نعمت بخشی ہے جو کہ انسان دوستی سے خالی ہو کر بالکل اجڑ چکے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے صوفیاء کرام ایک نئی اُمید کی کرن بن کر آئے۔

صوفیا نے اپنے مذہب کی تعلیمات کی روشنی مخلوق خُدا پر شفقت، غرباء اور مساکین سے ہمدردی اور شکستہ دلوں کو تسلی اور اطمینان کو اپنا شعار اور جزو ایمان بنایا ہے۔ تصوف کا مشاہدہ حواس سے نہیں ہوتا بلکہ وجدان سے ہو سکتا ہے۔ یہ ہر مذہب کا ایک قسم کا وجدانی پہلو ہوتا ہے۔ تصوف، عرفان نفس کا ایک ایسا راستہ ہے کہ جس پر چل کر انسانی نفس، حقیقت احد کا ادراک حاصل کرنے کے بعد حقیقت اولی سے روشناس ہوتا ہے۔ ماہرین لغات و فن نے تصوف کی مختلف تعریفیں متعین کرنے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔

(ج) تصوف لغوی و اصطلاحی مباحث:

تصوف کو اُردو اور فارسی زبان و ادب میں تصوف ہی کہتے ہیں، جبکہ انگریزی زبان میں لفظ تصوف کو Mysticism کہتے ہیں۔ عربی زبان میں "التصوف" اسی طرح ترکی زبان میں "تصوف" ہندی زبان میں "یوگ شاستر" جبکہ فرانسیسی زبان میں "Mystique" کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تصوف ایک بین الاقوامی نظریہ ہے اور ہر زبان وادب اور ہر تہذیب میں اس کے واضح آثار نظر آتے ہیں۔ لسانیات کے ماہرین و محققین کے درمیان لفظ " تصوف" اور لفظ صوفی ہر دور میں اختلافات کا شکار رہا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ لفظ "تصوف" یا "صوفی" قرآن مجید میں اور صحاح ستہ میں موجود نہیں ہے اور نہ ہی عربی زبان کی قدیم لغات میں اس کا ذکر کہیں ملتا ہے۔ بعض مورخین کے نزدیک لفظ "صوفی" ایسا لفظ ہے جو کہ "سوف" سے ماخوذ جس سے مراد حکمت و دانائی ہے۔ تصوف کے بارے میں ابوریحان البیرونی لکھتے ہیں:

> " تصوف کا لفظ اصل میں سین (تسوف) سے تھا اور اس کا مادہ "سوف" تھا۔ جس کے معنی یونانی زبان میں حکمت و دانائی کے ہیں چونکہ صوفیاء میں اشراقی حکما کا انداز پایا جاتا ہے، اس لیے ان لوگوں کو صوفی یعنی "حکیم" کہنا شروع کیا گیا جو رفتہ رفتہ "سوفی" سے "صوفی" ہو گیا"۔[1]

بعض علماء کا نظریہ کہ صوفی کی اصل "صفہ" ہے۔ "صفہ" سے مراد پیش دالان یا چبوترا، عہد نبوی ﷺ میں کچھ افراد مسجد نبویؐ کے شمال میں واقع چبوترے پر قیام فرماتے تھے۔ ان افراد کو "اصحاب صفہ" کا نام دیا گیا۔ یہ وہ صحابہ کرام تھے کہ جن کے پاس توکل اور فقر و قناعت کے علاوہ کوئی سرمایہ نہ تھا، عبادت کے علاوہ دنیا کے کسی کام کاج میں اُن کی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے ترک دنیا اختیار کر رکھی تھی۔ کھانے پینے اور دُنیا کے دوسرے معاملات میں ان کی کوئی ظاہری و باطنی شرکت نہ تھی۔ اُردو لغات کا تذکرہ کریں تو ہمیں لفظ تصوف کی تعریف کچھ یوں ملتی ہے:

"تصوف خواہشات نفسانی سے پاک ہونا، وہ علم جس کے وسیلے سے صفائی قلب حاصل ہو، تذکیہ نفس کا طریقہ، اشیائے عالم کو مظاہر صفات حق موجود سمجھ کر مشغولیت کا لائق نہ ماننا یا جاننا، مذہب صوفیاء"۔ (۲)

تصوف صرف روحانی اقدار کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ فکری، عملی، معاشرتی، تہذیبی ان تمام جہتوں میں احسان و اخلاص کا نام ہی اصل میں تصوف ہے۔ صوفی ازم کو ابتداء سے ہی اس بات کی علامت سمجھا گیا ہے کہ اس سے مراد دنیا کی عمومی زندگی کو ترک کرنا ہے۔ عرب کے قدیم زمانے میں بھی جب کوئی شخص زہد و تقوی کی طرف مائل ہوتا تو وہ "صوف" کا لباس زیب تن کر لیتا، جیسا کہ بہلول ابن ذھب نے جب تصوف کی راہ اختیار کی تو صوف پہن کر مدینہ کی پہاڑیوں کے اوپر چلا گیا۔ اسی طرح ایک دوسری مثال میں شیخ ابراھیم بن ادھم کا ذکر ہے کہ اُنہوں نے زُہد کے راستے کا جب چناو کیا تو اُس وقت اُنہوں نے ایک گڈریے سے صوف کا جبہ لیا اور اُس کو پہن لیا۔ ایران میں بھی پشمینہ پوش اُن لوگوں کو کہا جاتا تھا جو کہ متصوفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ فارسی زبان میں پشیمنہ پوش "صوفی" کو کہا جاتا ہے جو کہ اس کا اصل فارسی ترجمہ ہے۔ اُس دور میں جو تصوف وزُہد کی راہ کو اپناتا تو وہ صوف کو لباس کے طور پر استعمال کرتا، اس کو دنیا سے بے رغبتی اور زُہد اختیار کرنے کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر تصوف کے علم و عمل کو ایک خاص طبقہ سے وابستہ ہونا سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقی تصوف کی بنیادیں انسان کی شخصیت میں موجود ہوتی ہے جس کا خالصتاً تعلق قلب انسانی سے ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی تصوف کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"تصوف آٹھ خصائل پر مبنی ہوتا ہے، سخاوت، رضا، صبر، اشارہ، عزبتہ، صوف پہننا، سیاحت اور فقر، سخاوت حضرت ابراہیمؑ کی، رضا حضرت اسحاقؑ کی، صبر حضرت ایوبؑ کا، اشارہ حضرت زکریاؑ کا، عزبتہ حضرت یحییٰؑ کی، صوف کا پہننا حضرت موسیٰؑ، سیاحت حضرت عیسیٰؑ کی اور فقر حضرت محمد ﷺ کا شیوہ رہا ہے"۔ (۳)

بعض لوگ سلوک و تصوف کے جملہ احوال و آثار کو قرآن و سنت سے جوڑتے ہیں۔ اس ضمن میں بہ کثرت آیات و احادیث کا حوالہ دیتے ہیں۔ صوفیاء کرام نے قرآن پاک کی تفسیر بھی اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے کی ہے، اس لئے تصوف کی کتب میں صوفیانہ تفسیر کی وضاحت اور مثالیں بہت زیادہ پڑھنے کو ملتی ہیں۔ تصوف کے نظریہ سے لکھی جانے والی تفاسیر میں سے جو زیادہ مشہور اور شہرت کی حامل ہے وہ علامہ

آلوسی (۲۷۰) کی تفسیر "روح المعانی" ہے، لیکن اس میں اہم بات یہ ہے کہ قرآنی تفسیر میں تصوف کے اسرار رموز کو سمجھنے کی اہلیت وہی شخص کر سکتا ہے جو ان اسرار و غوامض کو بخوبی جانتا ہو۔

تصوف کی ایک اور واضح تعریف ولیم سٹوڈرٹ نے اپنی کتاب "Sufism" میں بیان کی ہے:

"In Arabic "Sufism"is called "Tasawwif" both words camefrom suf (Wool)a reference to the woolen robe worn by the earliest sufies".(۴)

تاریخی مذاہب کے ماہرین واکابرین اس بات کے حامی ہیں کہ تصوف دنیا کے ہر مذہب کا روحانی نظام کا بھی ایک خود کار عمل ہے جو کسی بھی مذہب میں کسی اہم رتبے یا اہم مقام تک پہنچنے کے بعد انسان کے اندر خود بخود جگہ بنا لیتا ہے۔ جامع الغات میں تصوف سے مراد ہے کہ:"صوفیوں کا عقیدہ، علم و معرفت، دل سے خواہش کو دور کر کے خُدا کی طرف دھیان لگانا، تزکیہ نفس کا طریقہ "۔(۵)

دینِ اسلام میں تصوف در حقیقت علم توحید کا ذریعہ ہے، یہ اسلام کی تربیت کا ایک نظام ہے، جس پر چل کر اللہ تعالٰی کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ بلاشبہ تصوف ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کو اُس منزل تک پہنچاتا ہے جہاں پر توحید الٰہی کی احدیت اور وحدت ان سب کا تعلق تجلیات خُداوندی سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالی کی معرفت اور خزائن الٰہی کے بحر بے کراں کے راستوں کی نشاندہی ہی تصوف کے ذریعے ہوتی ہے اور جس کے دروازے صرف اور صرف رشد و ہدایت کے ذریعے ہی کُھلتے ہیں۔ صوفی ازم کے ذریعے انسان اُس ذات باری تعالی سے مکمل رابطہ پیدا کر سکتا ہے جس کو وہ اپنا معبود مانتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن تصوف کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تصوف کی اصلاح بڑی عام فہم اور مبہم ہے، ہر وہ فلسفہ فکر جو کسی حد تک ماورائیت اور روحانیت پر ایمان رکھتا ہے۔ ایک کائناتی روح یا ہم آہنگی کا تصور رکھتا ہے اور اس تصور تک پہنچنے کے لئے عقل و شعور سے زیادہ ریاضت ور روحانی طاقت کو رہبر تسلیم کرتا ہے، تصوف کے دائرے میں آسکتا ہے۔ اس حلقے میں یونانی نو افلاطونی فلسفی آتے ہیں۔ ہندوستان میں ویدانت اور بدھ بت کے ماننے والے بھی شامل ہیں اور اسلامی تصوف کے مشائخ بھی"۔(۷)

صوفی ازم انسانی قلب کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ سر تا پا ایک ذوق وجدان ہے اس لئے اس کی کوئی

حتمی اور منطقی تعریف کو بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صوفی ازم کی حقیقت بیان کرنے میں ہماری اچھی سے اچھی عبارتیں اور فصیح تریں ترکیبات لفظی تشنہ تکمیل رہ جاتی ہیں۔ ماہرین تصوف نے اپنے طریقوں سے اس کی حقیقت کو واضح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن اس کی تعریف لفظی اس کے ایک یا کہ چند پہلوؤں کو ہی واضح کرتی ہے لیکن صوفیاء کرام کی بیان کردہ اصطلاح میں تصوف سے مراد یہ ہے کہ اپنے اندر کا تزکیہ اور تصفیہ کرنا، یعنی اپنے نفس کو نفسانی کدورتوں اور زائل اخلاق سے پاک اور صاف شفاف کرنا اور پھر اس کو فصائل اخلاق سے مزین کرنا تصوف کہلاتا ہے۔

صوفیاء کون ہیں؟

لفظ تصوف "صوف" سے مشتق ہے۔ صوف " اُون " کو کہا جاتا ہے اور اسی سے آگے لفظ "صوفی" بنا۔ تصوف ایک احساسی نظریہ ہے اس پر عمل پیرا ہونے والے کو صوفی کہا جاتا ہے۔ صوفی کے لئے انگریزی میں لفظ "Mystics" استعمال ہوتا ہے۔ صوفی لفظ صفا سے مشتق ہے صفا سے مراد ہی ہے کہ قلب کی صفائی چونکہ صوفی کا دل باطنی بیماریوں سے صاف ہوتا ہے اس لئے اُسے "صوفی" کے نام پُکارا جاتا ہے۔ در حقیقت صوفی ہے جو اپنے وجود سے فانی ہو کر حق کے راستے کو پالے، انسانی خواہشات سے وہ بالکل آزاد ہو کر حقیقت الحقائق سے یعنی کہ اللہ تعالی کے ساتھ واصل ہو گیا ہو صوفی کہلاتا ہے۔ لفظ "صوفی" کو معنوی نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو اس سلسلے میں حضرت علی ہجویریؒ اپنی کتاب " کشف المحجوب " میں فرماتے ہیں:

> "صوفی وہ ہے جس نے اپنے معاملات چاہے اخلاقی و معاشی یا دینی ومعاشرتی سبھی مہذب کر لئے ہیں اور اپنا دل کدورت اور آفات دنیا سے صاف کر لیا ہے۔ اس لئے انہیں صوفی کہتے ہیں"۔[۷]

صوفیاء کرام کا نفس اخلاق مذمومہ اور صفات خبیثہ سے پاک ہو جاتا ہے تا کہ دل غیر اللہ سے خالی ہو کر اللہ کے ذکر و فکر سے وابستہ ہو جائے، چنانچہ تصوف و سلوک کو عملی جامعہ اختیار کرنے والے کا نام صوفی رکھا گیا ہے۔ صوفی وہ ہوتا ہے جو نہ کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے اور نہ کسی سے بدکلامی کرتا ہے۔ صوفی کے دل میں رب کی محبت ہوتی ہے وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ ہندو ہو یا کہ یہودی سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ صوفی مخلوق خُدا سے بلا تفریق محبت کرتا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ چاہے کوئی مسلم ہو یا غیر مسلم سب کے ساتھ شفقت اور پیار سے پیش آتا ہے۔ صوفی کو اللہ تعالی کا خاص قرب حاصل ہوتا ہے۔ صوفی کا دل اور دماغ دنیاوی خواہشات، حرص، لالچ سے پاک ہوتا ہے۔ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہے۔ اصطلاحی طور پر

صوفی اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے دلی خیالات کو ماسوٰی اللہ سے محفوظ رکھے۔Julin Baddick صوفیائے کرام کی دُنیا کا ایک ایسا سالک بیان فرماتے ہے کہ جو ذکر اذکار کر کے خلوص قلب اور گریہ زاری کے ایسے راستے کا چناو کرتا ہے جس پر چل کر خُدا کے دوستوں کا مقام پالیتا ہے۔

"God and the Sufis have a special relationship which goes back to aprimordial covenant: The sufis are God's friends perpetually engaged In remembrance (DHIKR) of him".(۸)

صوفیاء چاہے جس بھی مسلک یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اُنہوں نے ہمیشہ وعظ و نصیحت ہی کو اپنا شعار بنایا ہے اور معاشرے میں بہتری لانے کے لئے اپنا اہم کردار بجالائے۔ برصغیر پاک وہند میں بھی اسلام کی ترویج کا بیڑا صوفیاء کرام نے اُٹھایا اُن بزرگانِ دین کی بدولت مذہب اسلام نے برصغیر پاک وہند میں خوب ترقی کی اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ صوفیاء اپنی زبان وبیان، طرز عمل، اور دعوت و تبلیغ کی اشاعت سے غیر مسلموں کو بھی اسلام کی طرف کیا۔

"تبلیغ کا یہی طریقہ مسلمان صوفیاء ہی نہیں ہندو یوگیوں کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق متصوفانہ زندگی کے لئے خود کو وقف کر دینے کا نام تصوف اور اس پر عمل کرنے والا صوفی کہلاتا ہے"۔(۹)

صوفیاء اپنے ادوار کے نہ صرف صوفی تھے بلکہ ایک مجاہد، باعمل انسان، وعظ، پند و نصائح اور اخلاقی تربیت کے باقاعدہ نمائندے تصور کیے جاتے ہیں. عابو نصر سراج "کتاب اللمع" میں ارشاد فرماتے ہیں:

"صوفیانہ لباس پہن لینے سے کوئی صوفی نہیں بن سکتا۔ تصوف تو اصلاح باطن کا نام ہے نہ کے پیوند لگی ہوئی گدڑی کا"۔(۱۰)

متصوفانہ طرز فکر کے اہم بنیادی اجزاء میں بھی ترک دنیا کو کلیدی اہمیت حاصل ہے لیکن تصوف کے اس پہلو سے بھی صوفیاء کرام میں اختلاف کا عنصر پایا جاتا ہے۔ کچھ صوفیاء دنیا کو ترک کرنے سے مراد دنیاوی آسائشوں سے اغماض لیتے ہیں۔ صوفی کے بارے میں حضرت عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

"صوفی کے معنی ہوں گے وہ ایک بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے صفائے قلب عطا فرمائی۔ صوفی ہے جو نفس کی آفتوں اور اُس کی برائیوں سے خالی ہو۔ خُدا کے

نیک راستے پر چلنے والا، حقائق کو گرفت میں لانے والا اور اپنے دل کو مخلوق
کے درمیان غیر متحرک محسوس کرنے والا"۔[۱۱]

صوفیاء کرام اللہ تعالیٰ کی وہ برگزیدہ ہستیاں ہے جن کو مذہب اسلام کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حسن سلوک اور حسن معاشرت میں رسول ﷺ کی تقلید اور پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ خدمت خلق کا جو جذبہ اُسوہ رسول ﷺ میں ملتا ہے وہی جذبہ خدمت کی جھلک صوفیاء کرام کی زندگی میں نظر میں آتی ہے۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ بے مثال نمونے، رنگ و نسل، قوم و مذہب کی کوئی بھی تفریق کیے بنا پوری خلق خُدا ہمدردی، بے سہاروں کی چارہ گری، یتیم بچوں کی دیکھ بھال، معذور لوگوں کی خبر گیری، ضرورت مندوں کی حاجت روائی، بیماروں کی تیمارداری کرنا، پوری انسانیت کی صلاح و فلاح کے لیے عملی اقدامات کرنا رسول ﷺ کی زندگی کا اُسوہ کامل تھا اور عملی زندگی میں یہی صوفیاء کرام کی تعلیمات و معاملات میں نظر آتی ہیں۔ صوفیاء بھی کائنات کے تمام لوگوں سے ہمدردی رکھتے، رنگ و نسل کی تمیز کیے بغیر سب کے ساتھ برابری کی بنیاد پر سلوک روا رکھتے۔ ابو اسحاق کلابازیؒ صوفیاء کرام کے باطنی و ظاہری مقام کو بیان کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالتے ہیں:

" یہ لوگ (صوفیا) بظاہر اجسام ہیں مگر روحانی ہیں، زمین پر ہیں مگر آسمانی
ہیں، یہ مخلوق کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ربانی ہیں۔ خاموش ہیں مگر سب
کچھ دیکھتے ہیں غائب ہیں مگر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہیں، یہ ہیں تو بادشاہ
مگر گدڑیوں میں ہیں۔ یہی ہ لوگ قبیلوں کی اصلاح کنندہ، صاحب فضلیت اور
دلائل کے نور ہیں۔ ان کے باطن صاف ہیں، وہ پوشیدہ ہیں، وہ صاحب صفا
ہیں، صوفی ہیں"۔[۱۲]

صوفیاء کی خانقاہوں و درگاہوں میں ہر نسل کے لوگ حاضر ہوتے۔ ان کی دروازے حاجت مندوں اور مساکین کے لیے کبھی بند نہ ہوتے۔ ان سے سب فائدہ اُٹھاتے اور اس کی سب بڑی وجہ یہ تھی کہ صوفیائے کرام حقیقت میں اپنے شب و روز کے معمولات میں اصلاحی و فلاحی کاموں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ کسی انسان کو تکلیف میں دیکھتے تو اُن کا دل پریشان ہو جاتا تھا۔ جس جگہ بھی ہوتے اور جس حال میں ہوتے تھے خلق خدا کے لیے نفع رسانی کی کوششوں میں دن رات مصروف عمل رہتے تھے۔ صوفیائے کرام کے حالت زندگی کو بیان کرتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیاؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"ترک دُنیا کے یہ معنی نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو ننگا کرلے اور لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ ترک دُنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے اور کھائے بھی اور حلال کی جو چیز پہنچے اُسے روا رکھے، لیکن اُس کو جمع کرنے کی طرف رغبت نہ کرے اور دل کو اس سے نہ لگائے، ترک دُنیا یہ ہے"۔[۱۳]

تاریخی تناظر میں دیکھے تو صوفی لوگوں نے ہمیشہ سادگی کو اپنا شعار بنایا۔ دُنیاوی عیش و عشرت سے کنارہ کیا، اپنی ضروریات زندگی کو اس قدر محدود کر لیا کہ بہ مشکل زندگی کا گزر بسر ہوتا تھا۔ اکثر اوقات خود کو بھوکا رکھتے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے۔ سادگی و قناعت پسندی صوفیاء کی زندگی کا شیوہ تھا۔ اے۔ جے۔ آربری "The Doctrine of the Sufis" میں صوفیاء اور خصوصاً شامی صوفیاء کے حوالے لکھتے ہیں:

"Sufis:The Syrians called them "STARVERS"because they only took As much food as much keep up their strength in time of necessity ...Sufi is one who possesses nothing".[۱۴]

صوفیاء کی زندگی کا گزارہ ایسے ہوتا کہ وہ کبھی غذا کا ذخیرہ نہ کرتے۔ حاجت مندوں کے لیے دروازے ہر وقت کھلے رکھتے۔ اپنے کردار اور زندہ دلی سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے۔ اپنے مثالی کردار سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے۔ مخلوق خُدا سے اُنس اور بے لوث محبت صوفیاء کی زندگی کا اہم وصف تھا۔

عرفان کیا ہے؟

"علم" لفظ "عرفان" اور "معرفت" کا لغوی معنی ہے بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے لفظ عرفان معرفت اور علم ایک دوسرے کے مترادف الفاظ ہیں۔ عربی لغات میں "معرفت" ایک لفظ ہے اور معرفت سے مراد یہ ہے کسی بھی چیز، شخصیت کو جاننا اور اس بارے میں پہچان کرنا معرفت کہلاتا ہے۔ لغات میں جو اس کا اصل مادہ ہے وہ ہے "عرف" صیغے، اسماء اور ابواب کو عام مستعمل میں کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے۔ عرفہ، یعرفہ، معرفتہ و عرفانا۔ اصطلاح میں معرفت سے مراد اللہ تعالیٰ کی پہچان ہے۔ انسان اپنے اندر شعور کو اس قدر روشن کرے کہ اُس کو اللہ کی پہچان نصیب ہو۔ یہی چیز عرفان یا معرفت کہلاتی ہے۔ معرفت و عرفان ایک شعوری دریافت کا نام یہ کسی پر سرار یا کہ پوشیدہ چیز کا نام نہیں۔ معرفت یا عرفان کا لغوی مطلب یہی ہے کہ انسان اللہ کی دی

ہوئی کسی نشانی پر غور و فکر کرے اُس کی حقیقت سے روشناس ہو جبکہ اللہ کی معرفت یا عرفان یہ ہے کہ اللہ کو اُس کی دی گئی نشانیوں میں شعوری سوچ کے ذریعے حاصل کرے۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معرفت کا تعلق انسان کی غور و فکر سے ہے۔ معرفت کا تعلق کسی مجرد علم سے نہیں ہے۔جب کوئی شخص عرفان کو اپنا مرکزِ توجہ بنالیتا ہے تو وہ لگاتار اس بارے میں سوچتا ہے۔وہ تخلیقات کے اندر خالق کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔اس غور و فکر اور سوچ بچار سے اُس کے اندر ایک نئی شخصیت ظاہر ہوتی ہے اور اُس شخصیت کا نام "عارف" ہے۔ جس شخص کو اِس قسم کی معرفت سے واسطہ پڑ جاتا ہے اور جب اُس کو یہ معرفت مل جاتی ہے تو پھر وہ ایک سنجیدہ انسان بن جاتا ہے۔وہ ہر شے کا مشاہدہ عرفانہ نظر سے کرتا ہے۔ پھر انسان اپنا محاسبہ شدت کے ساتھ کرتا ہے۔اُس کی زندگی کے معاملات میں،اخلاق میں،عبادات میں عارفانہ اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ اولیاء کرام کے ہاں " معرفت" علم کو کہتے ہیں اسی لیے اولیاء کی نظر میں ہر معرفت علم ہے اور ہر علم معرفت ہے اور جو شخص عالم باللہ ہو گا وہ عارف باللہ بھی ہو گا اور اسی طرح ہر عارف عالم بھی ہے۔ صوفیاء کرام کے نزدیک معرفت سے مراد یہ ایک ایسے شخص کی صفت ہے جو کہ اسماء اور صفات کے ساتھ ساتھ حق تعالی کو پہچان سکے اور اللہ کے ساتھ اُس کے معاملات حق، سچائی، اور اخلاص پر مبنی ہوں۔اس طرح اپنے تمام احوال میں معاملات میں صدق دل سے اور خلوص سے عمل پیرا ہو۔ ہر گھڑی، ہر لمحہ اُس کا اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنا ثابت ہو اور ہر وقت اللہ کی یاد میں رہے،ایسی صورت میں بندہ عارف کہلاتا ہے اور اُس کی حالت معرفت کہلاتی ہے۔ بندہ جس قدر اپنے نفس سے بیگانہ بنے گا اُسی قدر اُس کو اللہ تعالی کی معرفت نصیب ہو گی۔ علم عرفان ایسا علم ہے جو انسان کو برائیوں سے نکال کر اچھائی کی طرف لے جاتا ہے۔اس علم کے شرط یہ ہے کہ انسان کی نیت صاف ہو اور دنیاوی کاموں کی لالچ نہ ہو۔ خدا سے خُدا کے سوا کسی چیز کا سوال نہ کرنا عرفان کہلاتا ہے۔عام طور پر علم کی تین قسمیں ہیں ۔ ایک علم جس کا تعلق احساسات اور مشاہدات سے ہوتا ہے،دوسرا علم جو کہ ادراک اور عقل کے ساتھ وابستہ ہے اور تیسرا علم جس کو عرفان یا کہ معرفت کہتے ہیں۔ جامعات میں جتنا بھی کام ہو رہا ہے وہ محسوسات مشاہدات ادراک اور عقل کے ساتھ وابستہ ہے لیکن عرفان ایک ایسا علم ہے جو کے خُدا تک لے جانے اور حقیقت سے آشکار ہونے کا علم ہے۔اس سے حقیقت تک آشنائی حاصل ہوتی ہے۔

(د) اُردو ناول میں تصوف کی روایت

اُردو زبان میں ناول مغربی ادب کے ذریعے سامنے آیا۔ مغربی ناول اپنے مزاج اور موضوع کے اعتبار سے اپنے معاشرتی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ اُردو میں ناول مغربی ادب کی دین تو ہے لیکن انداز بیان کے تناظر میں اور مزاجی طور پر اس میں مشرق کے بہت ہی قدیم داستانی عناصر کی گہری چھاپ ہے۔ اُردو ناول نے در حقیقت مخصوص ہندوستانی معاشرہ اور سماج میں پروان چڑھتے ہوئے اپنی اصل کو مضبوط تر کیا۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ ناول کو مغربی ادب کی صنف قرار دے کر اس کا مطالعہ مغربی ادب کے تنقیدی اصولوں کو مد نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کو بھی انہیں تنقیدی اصولوں کو سامنے رکھ کر پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں تجزیہ و تنقید میں ڈاکٹر احسن فاروقی اس درجہ مغربی واقع ہوئے ہیں کہ وہ نذیر احمد کے ناولوں کو ناول صنف میں لینے کے بجائے اُن کو تماثیل کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ تمثیلی جہان پر نگاہ دواڑئیں تو یہ حقیقت ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد ایک خاص زاویہ نگاہ سے اور ایک مخصوص حد تک تمثیلی پیرایہ میں واقعات کو پیش کرتے ہیں لیکن اس طرح نذیر احمد کے ناولوں کو ناول صنف سے خارج کر دینا مناسب نہیں۔ ابتداء کے ناولوں میں جیسے مراۃ العروس اور بنات النعش میں تمثیل نگاری کے آثارات تو موجود ہیں، لیکن آہستہ آہستہ کرتے ہوئے اُن کی یہ تمثیل نگاری ناول کے اصل رنگ میں ڈھلتی گئی اور اس کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں "رویائے صادقہ" "ایامی" محصنات وغیرہ کو مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے سب ناولوں میں دین کی تبلیغ اور اصلاح پسندی کے عنصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

نذیر احمد انسان کے منفی رویوں اور اس کی بے قراری کا حل روحانیت کی بیداری کو ہی سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تحریروں میں بعض اوقات ایک فن کار سے زیادہ مصلح، واعظ، اور ایک صوفی کے طور پر نظر آتے ہیں جو معاشرتی برائیوں کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور اپنی وعظ و تبلیغ کے ذریعے ان تمام مسائل کا حل مذہبی اصولوں کو سامنے رکھ کر ایک مذہبی دائرکار میں ڈھونڈتے ہیں، ان مقاصد میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ وہ ناول کے بنیادی فنی اجزاء اور اس کی ہئیت سے انحراف کرنا بالکل جائز سمجھتے ہیں۔

مراۃ العروس

اس ناول کی کہانی بنیادی طور پر اکبری اور اصغری کے گرد گھومتی ہے۔ اکبری کو نانی اماں کے لاڈ پیار نے بگاڑ کے رکھ دیا جبکہ دوسری طرف اصغری کا مزاج اور طبعیت اکبری سے بالکل مختلف شستہ و شائستہ ہے۔

اکبری کی جب شادی محمد فاضل نامی شخص سے ہوئی تو اکبری شادی کے چند دن بعد جھگڑا کر کے واپس میکے آگئی ،گھر واپس اس شرط پر آئی کہ اُس کو الگ گھر میں رکھا جائے گا لیکن یہاں بھی رہی سہی کثر ایک کٹنی حجن بی نے پوُری کر دی اور اکبری کے زیورات چوری کر لئے۔ کہانی کے اس موڑ پر ایک پر اسرار اور خوفناک جزیرے پر گوشہ نشین دُنیا کو ترک کرنے والے ایک درویش کا قصہ بیان کیا جاتا ہے جو کہ براہ راست متصوفانہ فکر کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

دوسری طرف اصغری کا کردار ہے جو کہ فہم وادراک کا ایک عملی نمونہ ہے۔اصغری کی خوش اخلاقی اور خوش انتظامی نے گھر کے سارے ماحول کو بالکل بدل کر رکھ دیا،اس نے اپنے مثالی کردار سے ماما عظمت جیسی عورت کی لوٹ کھسوٹ کو بھی ختم کر دیا۔اصغری نے اپنی بہترین مہارانہ تربیت سے نہ صرف اپنی نند محمودہ کی بہترین تربیت کی بلکہ اُس کی شادی ایک اچھے گھرانے میں کرا دی۔اس پوری کہانی میں اصغری کا کردار جگہ جگہ صوفیاء کرام کی طرز کا تھا۔اپنے بہترین طرز عمل سے خواتین کو سلیقے سے زندگی گزارنے کا ڈھنگ اصغری سکھاتی ہے اور خواتین کی زندگی میں جو اوہام پرستی اور بد اخلاقی نے جو برائیاں پیدا کیں اُن کی روک تھام کے لئے بھی اصغری اپنا کردار ادا کرتی ہے۔اصغری کا قائم کردہ مدرسہ متصوفانہ خانقاہی نظام کی پوری ایک تصویر پیش کرتا ہے اس مدرسہ میں نظریات،افکارواعتقادات سے لاپرواہی برتنے والے لوگوں کی باقاعدہ روحانی تربیت اسلامی شعار کے مطابق کی جاتی،اسلامی طرز زندگی کا فروغ متصوفانہ انداز سے بھرپور ہوتا ہے۔ متصوفانہ انداز میں زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جاتی۔

توبتہ النصوح

" توبتہ النصوح " ڈپٹی نذیر احمد کا ایک شاہکار ناول ہے،اس ناول میں اہم کردار نصوح کا ہے۔ ناول میں نصوح کی کہانی کو خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ نصوح دہلی میں اپنے تین عزیزوں کو ہیضے کی وباء کی وجہ سے کھو دیتا ہے۔وہ حساب کاروز اور آخرت کا منظر ایک دن خواب میں دیکھتا ہے اس خواب سے حقیقی زندگی اُس پر آشکار ہوتی ہے۔دُنیا کی بے ثباتی اور لوگوں کے دلوں کی منافقت کا راز اُس پر کُھل جاتا ہے بالکل ایسے جیسے صوفیاء کرام کی وعظ ونصیحت سے ایک غفلت کا مرتکب شخص بیدار ہوتا ہے اس کے بعد نصوح اپنے گھر کے تمام افراد کو صراط مستقیم پر لانے کی ہر ممکن کوشش میں محو ہو جاتا ہے۔وعظ ونصیحت کا اس قدر ٹھوس اثر ہوتا ہے کہ اُس کی بیٹی نعیمہ جس نے زندگی میں کبھی نماز روزہ نہیں کیا وہ باقاعدہ صوم وصلوۃ کی پابند ہو جاتی ہے اور وہ بہت قلیل وقت میں دین دار خاتون بن جاتی ہے۔نعیمہ کی زندگی بدلنے میں اُس کی خالہ زاد بہن صالحہ کا

بڑا ہاتھ ہے، وہ اپنے نام کی طرح کردار اور فعل میں بھی صالحہ عورت تھی۔ نذیر احمد کے بقول اس عورت کا ایسا مثالی کردار ہے کہ جس کے دل میں متصوفانہ افکار و اعمال کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے:

"جتنی سلائی ہوتی ہے سب اللہ کے نام دے دیتی ہے ایک پیسہ اپنے اُوپر خرچ نہیں کرتیں اپنے ہاتھوں گھر کا سارا کام کاج اور نماز کی یہ پابندی کہ نماز تہجد تک قضاء نہ ہونے پاتی ۔ کتنوں کو حیوان سے انسان بنایا اور بے غرض ، بے مطلب"۔[۱۵]

کلیم بیٹے کے علاوہ نصوح کی ساری اولاد سدھر گئی لیکن کلیم گھر والوں سے جھگڑا کر کے ناراض ہو کر دولت آباد میں ایک رئیس کے پاس چلا گیا وہاں اُس کی کوئی قدر نہ ہوئی اُس کو ایک جھگڑے میں گولی لگ گئی۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں باپ بیٹا آپس میں ملتے ہیں لیکن عین اُس وقت جب نصوح اپنے بیٹے کی حالتِ زار کو دیکھتا ہے تو کوئی شکایت اپنی زبان پر نہیں لاتا اُس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ جانتے تھے کہ بزرگان دین پر اس سے کہیں زیادہ مصیبتیں نازل ہوئیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔"[۱۶] کلیم اس موقع پر اپنے باپ سے معافی مانگتا ہے اور راہ عدم کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں وعظ، نصیحت کی جھلک خوب نظر آتی ہے۔ پُورا ناول مصلحانہ رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس ناول میں نصوح ،صالحہ اور حضرت بی کا کردار وعظ، تبلیغ اور رشد وہدایت کے استعارے ہیں ۔ جس میں کوئی بزرگ یا کوئی مافوق الفطرت واقعہ انسان کی زندگی میں تبدیلی برپا کر دیتا ہے اس طرح ایک خواب سے ہی نصوح کی زندگی یکسر بدل جاتی ہے۔

رویائے صادقہ

رویائے صادقہ ناول میں صوفیانہ رنگ اور غیب دانی کے آثار جابجا ملتے ہیں۔ اہم کردار صادقہ کا ہے جو کہ میر خسرو کی سب سے بڑی بیٹی ہے۔ صادقہ کو آنے والے حالات واقعات کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ ہی صادقہ کو سچے خواب آتے ہیں۔ صوفیانہ اشاروں میں ایسی صورت حال کئی مقامات پر سامنے آتی ہے کہ جہاں صوفیاء درویش اور یوگی مستقبل میں آنے والے واقعات کے بارے میں اشارات دیتے ہیں۔
صادقہ بھی ان حقائق کو خوابوں کے ذریعے معلوم کر لیتی ہے، شادی کو ابھی کچھ دیر ہی ہوتی ہے کہ اُسے خواب میں اپنا شوہر دیکھائی دیتا ہے۔ وہ جب خواب میں اپنے شوہر کو دیکھتی تو اُس کا لباس تو قیمتی ہے لیکن اُس لباس میں ہر جگہ داغ لگے ہوتے ہیں۔ صادقہ کا شوہر صادق جب ان گندے داغوں سے نجات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اسی اثنا میں صادقہ کے خواب میں ایک بزرگ ہستی آتی ہے اور وہ بزرگ بتاتے ہیں کہ

یہ دھبے صرف مٹی سے صاف ہوں گے۔ صادقہ اس خواب کی تعبیر جب اپنے شوہر کو بتاتی ہے تو اس دوران اُس پر تصوف کی گہری چھاپ واضح طور پر نمایاں ہوتی ہے:" شیر وانی تمھارا دل ہے اور سیاہی کے دھبے تمھارے مذہبی شکوک ہیں اور مٹی سے مراد خاکساری ہے"۔[۱۷]

اُس کے بعد صادقہ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ وہ بزرگ اور شوہر آپس میں توہمات و ابہامت پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں تو صادق کے دامن سے داغ دھبے یعنی کہ مذہبی شکوک و شبہات آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں اور اُس کا سارے کا سارا لباس صاف شفاف ہو جاتا ہے۔ صادقہ کے شوہر کی باطنی و ظاہری اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ ایک سچا مسلمان جیسے ہی بنتا ہے تو اُس کے خوابوں کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ناول میں جن موضوعات پر بات کی گئی اُن میں خُدا کی حاکمیت و واحدنیت، توحید کا ثبوت اور ساتھ ساتھ یہ بھی تبلیغ کی گئی ہے کہ انسان دنیاوی فکر سے نکل کر آخرت کی فکر بھی کرے۔ مجموعی طور پر نذیر احمد کے ناولوں کی سب سے اہم وصف اُن کا مصلحانہ انداز ہے جو کہ صوفیاء ہی کی قائم کردہ وعظ و تبلیغ کا ایک قسم کا ردعمل ہے

فسانہ آزاد (رتن ناتھ سرشار)

"فسانہ آزاد" رتن ناتھ سرشار کا سب سے اہم اور مقبول ترین ناول ہے جو کہ اپنے مزاجی اعتبار سے "اولین سیکولر" ناول سمجھا جاتا ہے آزاد کے کرداروں کی ایک اہم خوبی ہے جو اُس کو مافوق الفطرت خصوصیات کی بناء پر سپر مین کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ وہ اُس کو ہر میدان جنگ میں کامیابی عطا کرتی ہے۔ احمد علی فاطمی آزاد کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہ (سرشار) آزاد کو جنم دیتے ہیں اور اُسے نہ صرف جسمانی طور پر ایک شہری سے توانا قرار دیتے ہیں بلکہ دوسرے جملہ اوصاف کے اعتبار سے بھی اُسے ایک، سپر مین بنا کر پیش کرتے ہیں"۔[۱۸]

فسانہ آزاد میں دو متصوفانہ افکار و نظریات کا مزید احساس ہوتا ہے۔ سب سے پہلے فراریت کا احساس ہوتا ہے جو اس ناول کے ہر صحفے پر جلوہ فگن افیمی، چانڈو، نوابوں، بھانڈوں، اور مضامین کے کرداروں میں عیاں ہوتی ہے جبکہ اس ناول کا دوسرا اہم پہلو اصلاح پسندی ہے۔ رتن ناتھ سرشار فسانہ آزاد کی کہانی سنا کر ذہنی سکون اور لطف کا سبب تو ضرور بنتے ہیں لیکن اس بات چیت اور بحث و مباحثہ کے ذریعے معاشرے کو اصلاح ذہنی کی طرف مائل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اعمال کی درستی کرتے ہیں جو کہ تصوف کا ایک اہم مقصد ہے۔ اِس سے ہی متصوفانہ زندگی پروان چڑھتی ہے اور انسانی وجود کی اصلاح ہوتی ہے۔ فسانہ آزاد اپنے

اندر تصوف کو خوبصورت انداز میں سموئے ہوئے ہے۔

پیر کامل

جدید ناولوں میں عمیرہ احمد کا ناول "پیر کامل" زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔اس کی مقبولیت کی بنیادی طور پر دو وجوہات ہیں۔ایک اس ناول کا زبان و بیان اور دوسرا کہانی پر مضبوط گرفت ہے جو اس ناول کو دور حاضر کے ناولوں میں ممتاز کرتا ہے۔پیر کامل میں متصوفانہ نقطہ نظر کی واضح جھلک نظر آتی ہے جس کو بانو قدسیہ نے اپنے ناول راجہ گدھ میں بیان کیا اور الکھ نگری میں ممتاز مفتی نے اس کو پیش کیا۔پیر کامل میں آج کے جدید دور کے انسان کی ذہنی بے راہ روی کا علاج مذہب کی روحانیت میں تلاش کیا گیا ہے۔روحانی مرکزیت اور نظریات کے لحاظ سے اس ناول میں قادیانیوں کے مذہبی پہلو کو زیر بحث لایا گیا۔ناول میں قادیانی ہیروئن امامہ ہے۔یہی امامہ جو کہ ڈاکٹر بننے کا کا خواب دیکھ رہی ہوتی ہے تو وہ اُس وقت ذہنی پریشانی کا شکار ہو جاتی ہے جب اُس کی ایک سہیلی اُس کو یہ بات باور کراتی ہے کہ تم قادیانی مذہب سے وابستہ تو ہو لیکن تم ہو غیر مسلم حالانکہ امامہ کو یہ بات بچپن میں بتائی جاتی ہے کہ وو ایک کھری اور سچی مسلمان ہے۔امامہ خود کو سہیلی کے سامنے مسلمان ہونے کا یقین دلاتی ہے لیکن جب وہ قادیانی مذہب کا اور مذہب اسلام کا عمیق مطالعہ کرتی ہے تو یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ قادیانیت اور مذہب اسلام دو الگ نظریہ رکھنے والی قوتیں ہیں کسی ایک کو تسلیم کرنا ہی دوسرے کو ردّ کرنا ہے۔اسی ذہنی الجھن میں وہ اپنے قادیانی مینگتر وسیم سے شادی کرنے کے لئے گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ایک جدید صوفی ڈاکٹر سبط علی سے جا کر ملتی ہے۔ناول پیر کامل کا اہم اور متصوفانہ کردار ڈاکٹر سبط علی کا ہے جو کہ امامہ کو اپنی پناہ میں رکھ کر اُس کے ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو ختم کرنے کے لئے عمل کا آغاز کرتا ہے۔سبط علی جدید علوم وفنون کا ماہر ہے اور اُس کی عمر ساٹھ سے پنیسٹھ سالہ ہے۔سبط علی نہ صرف اپنے معتقدین کی روحانی تربیت کرتا ہے بلکہ مذہب ،معاشیات ، اور سیاست جیسے موضوع پر گفتگو کرنے کا ماہر ہے۔سبط علی روحانی تربیت کے لئے کوئی مخصوص گھر یا ڈیرہ نہیں بناتا۔کوٹھی میں ہی اُس نے ایک کمرہ کو وعظ و نصیحت کے لیے مختص کر رکھا تھا۔یہاں پر لوگ طے شدہ وقت کے مطابق آتے اور سبط علی تمام مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں بتاتا۔مزاجاً سبط علی روایتی قسم کی پیر پرستی کو پسند نہیں کرتا۔اس لئے سب معتقدین کو یہ ہدایت کی جاتی کہ سبط علی کے کمرہ میں آنے پر کوئی شخص اپنی جگہ احتراماً کھڑا نہ ہو۔عمیرہ احمد نے اس جدید صوفی کا حلیہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"ٹھیک آٹھ بجے اُس (سالار) نے ساٹھ پنیسٹھ سال کے ایک آدمی کو

اندرونی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اس کی توقع کے برعکس وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی استقبال کے لئے احتراماً کھڑا نہیں ہُوا۔ آنے والے نے ہی سلام میں پہل کی تھی جس کا جواب وہاں موجود لوگوں نے دیا۔ آنے والے کے احترام میں کھڑا نہ ہونے کے باوجود سالار اب اچانک وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نشست کے انداز میں احترام دیکھ رہا تھا۔ وہ سب یک دم بہت چوکنے اور محتاط نظر آنے لگے تھے۔ آنے والے یقیناً ڈاکٹر سید سبط علی تھے۔ وہ کمرے کی ایک دیوار کے سامنے اس مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے، جہنیں شاید اُنہی کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھے اُن کی رنگت سرخ اور سفید تھی اور یقیناً جوانی میں وہ بہت خوبصورت ہوں گے اُن کے چہرے پر موجود داڑھی بہت لمبی نہیں تھی مگر بہت گھنی اور نفاست سے تراشی گئی تھی۔ داڑھی مکمل طور پر سفید نہیں ہوئی تھی۔ اور کچھ یہی حال اُن کے سر کے بالوں کا بھی تھا۔ سفید اور سیاہ کے امتزاج نے اُن کے چہرے اور سر پر موجود بالوں کو بہت باوقار کر دیا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر دائیں طرف موجود کسی آدمی کا حال دریافت کر رہے تھے۔ شائد وہ کسی بیماری سے اُٹھ کر آیا تھا۔ سالار نے چند ہی لمحوں میں اُن کے سراپے کا جائزہ لیا تھا۔ وہ اور فرقان باقی لوگوں کے عقب میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر سبط علی نے اپنے لیکچر کا آغاز کیا اُن کا لب ولہجہ بے حد شائستہ تھا اور انداز دھیما تھا۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ سالار کو اُن کے ابتدائی چند جملوں سے ہی اندازہ ہو گیا تھا وہ ایک غیر معمولی عالم کے سامنے تھا"(۱۹)

ڈاکٹر سبط علی "شکر" کے موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے پُر اثر انداز میں مثالوں کے ذریعے وہ اپنی بات کی اور موضوع کی وضاحت بیان کر رہے تھے۔ اُن کے لہجے میں ایک درویشانہ طرز کے آثار واضح انداز میں دیکھائی دے رہے تھے۔ سالار جس کی زندگی نشے اور جنسی غفلت میں گزرتی ہے وہ سبط علی کے سادہ صوفیانہ انداز سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ سبط علی سالار کو یہ بات بتاتے ہیں کہ وہ اسلام کو محض ایک ذاتی فعل کے طور

پر اور مسجد کی چار دیواری کے اندر قید نہیں دیکھنا چاہتے بلکہ اسلام کو عملی زندگی کا محور و مرکز دیکھنا چاہتے ہیں۔اس کے بعد سالار ڈاکٹر سبط علی سے مسلسل رابطے میں رہتا ہے۔سالار کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ سبط علی کے پاس وہ ایک جادو ہے جو اُس کو ذہنی و نفسیاتی پریشانیوں سے نکال کر منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ناول میں ڈاکٹر سبط علی کا مزاج روایتی قسم کے دانشور کا نہیں بلکہ ایک صوفیانہ مزاج کے حامل انسان کا ہوتا ہے۔سالار کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو شکوک وشبہات اور ابہامات مذہب کے حوالے سے اُس کے ذہن میں اُٹھتے ہیں اُن کا حل ڈاکٹر سبط علی سے کیے گئے سوالات کے جوابات میں مل جاتا ہے:

> "ڈاکٹر سید سبط علی ابہام دور کرنے میں کمال رکھتے تھے وہ اُن کے پاس خاموش بیٹھا رہتا۔صرف سنتا، صرف نتیجے اخذ کرتا، کوئی دھند تھی جو چھٹ رہی تھی۔کوئی چیز تھی جو نظر آنے لگی تھی۔جن سوالوں کو کئی سالوں سے سر پر بوجھ کی صورت میں لیے پھر رہا تھا۔اُن کے پاس اُن کے جواب تھے۔اسلام کو سمجھ سمجھ کر سکھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس میں کتنی وسعت ہے یہ تنگ نظری اور تنگ دل کا دین نہیں ہے اور نہ ہی ان دونوں چیزوں کی اس میں گنجائش ہے یہ میں سے شروع ہو کر ہم پر جاتا ہے، فرد سے معاشرے تک ،اسلام آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ چوبیس گھنٹے سر پہ ٹوپی ،ہاتھ میں تسبیح پکڑے ہر جگہ مصلٰے بچھائے بیٹھے رہیں۔ہر بات میں اس کے حوالے دیتے رہیں، نہیں یہ تو آپ کی زندگی سے آپ کی اپنی زندگی سے حوالہ چاہتا ہے۔یہ تو آپ سے راست بازی اور پارسائی کا مطالبہ کرتا ہے، دیانت داری اور لگن چاہتا ہے۔اخلاص اور استقامت مانگتا ہے۔ایک اچھا مسلمان اپنی باتوں سے نہیں اپنے کرداروں سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے"۔(۲۰)

اس طرح ڈاکٹر سبط علی اپنی واعظ اور تبلیغ سے لوگوں کو ذہنی کرب سے نکال کر ایک متوزان اور ایک باعمل انسان بننے کی راہ دکھاتے ہیں۔امامہ اور سالار کی زندگی میں سالکانہ جستجو کے آثار واضح دیکھائی دیتے ہیں۔سالار مادی بے اطمینانی و بے سکونی سے جبکہ امامہ نظریاتی بے سمعتی کا شکار ہے۔دونوں صراۃ مستقیم کی تلاش میں نکلتے ہیں اور پر اسرار طریقے سے ڈاکٹر سبط علی سے ملاقات کرتے ہیں۔جو ان دونوں کی زندگی کا

مقصد متصوفانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر سبط علی ایک جدید پیر و مرشد کے انداز اور صورت میں سالار اور امامہ کی روحانی زندگی کی ابتداء کرتے ہیں۔

بستی

انتظار حسین کے ناول " بستی" میں ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ اور سقوط ڈھاکہ کو ایک نئے داستانی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جب پاکستان ۱۱ دسمبر کو بنگلہ دیش میں جنگ ہار جاتا ہے تو ایسے میں مصنف بہت ہی مایوسی اور غم کے عالم میں ایک خواب دیکھتا ہے۔ خواب میں ایک ایسی بستی کو دیکھتا ہے جس کے رہنے والے اپنی سرزمین پر اپنی ہی شکست کو دیکھ کر ہانپ رہے ہیں۔ مصنف خواب کی دُنیا میں ایک ایسی جھیل کا نظارہ کرتا ہے کہ جس میں ایک کچھوا اور ایک ہاتھی برسرپیکار ہیں۔ اس حیرت والے نظارے کا مطلب بتانے کے لئے داستانوں میں ایک بزرگ کی مانند ایک مرد فقیر ظاہر ہوتا ہے۔

> " میں نے اُس کے روبرو پہنچ کر دست بستہ کہا کہ اے مرد بزرگ تُو نے کیا دیکھا؟ وہ بولا کہ اے عزیز، آدمی تین چیزوں کے ہاتھوں خوار ہوتا ہے، عورت کے ہاتھوں جب وہ وفادار نہ رہے، بھائی کے ہاتھ جب وہ حق سے زیادہ مانگے، علم کے ہاتھوں جب وہ ریاضت کے بغیر حاصل ہو جائے، میں یہ سن کر اُس بزرگ کا منہ تکنے لگا"۔ (۲۱)

فقیر، درویش کا تصوف سے گہرا ربط ہے۔ ۱۲ دسمبر کو مصنف دوبارہ اسی قسم کا خواب دیکھتا ہے۔ یہ خواب مصنف کے معاشرے میں بسی بے یقینیت کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔ مصنف انتظار حسین ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شہر لاہور کو دشمن سے بچانے کے لیے روحانی بزرگوں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ناول میں بابا ازم کا کردار افضال کے ذریعے کیا گیا ہے جس کے سرسری سے آثار ناول میں دیکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ افضال کا کردار خالص مذہبی کردار نہیں۔ افضال کی یہ خواہش ہے کہ چند صالح لوگ اُسے مل جائیں جن کی مدد سے وہ پاکستان کے نظام کو چلا سکے۔ اس نقطہ نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو پاکستانیت اور بابا ازم کے ابتدائی آثارات ممتاز مفتی سے پہلے انتظار حسین کے ہاں بھی موجود تھے۔

خون جگر ہونے تک

قحط بنگال کے سانحے سے جڑی انسانی جذبات پر مبنی ایک کہانی ہے جس کو فضل کریم فضلی نے " خون جگر ہونے تک" کے عنوان سے تحریر کیا۔ فضل کریم فضلی نے ناول میں انسانی المیے کی سفاکی کو طنز کا نشانہ بنایا

ہے۔اس ناول میں متصوفانہ عناصر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ناول میں "پیر جی" کے عنوان سے کردار پیش کیا گیا۔یہ کردار اعمال و افکار کے حوالے سے تصوف کا ایک صحت مند کردار ہے جو کہ قاری کے سامنے پیش کیا گیا۔کہانی کا کردار " جمعدار صاحب" پیر جی سے اُن دو غیر مسلموں کا تذکرہ کرتا ہے جو دوسرے مسلمان بھائیوں کی نسبت جمعدار کے بیٹے کا خاص خیال رکھتے تھے۔ایسے موقعہ پر پیر صاحب کا جواب صوفیانہ رنگ میں دیا جاتا ہے:

> "غور سے دیکھئے تو ہم میں اور اُن میں کیا فرق ہے؟ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ خُدا کو مانتے ہیں لیکن کیا واقعی ایسا ہے؟اگر ہم سچ مچ خُدا کو مانتے تو یہ سمجھتے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ سب خُدا دیکھتا ہے اس لیے کوئی ایسی بات نہ کریں جو اُس کے حکم یا مرضی کے خلاف ہو۔ہم جو ایسا نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے نا کہ ہم زبان سے جو چاہے کچھ کہیں لیکن دل سے یہ نہیں سمجھتے۔سچ تو یہ ہے کہ یا تو ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں یا منافقت کر رہے ہیں،تو جہاں تک خُدا کو ماننے نہ ماننے کا تعلق ہے۔ہم میں اُن میں کوئی خاص فرق نہیں"۔(۲۲)

کہانی میں پیر صاحب کے قلب کی حقیقت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔جس کے مطابق پیر صاحب روایتی پیروں کی طرح ایک موقع پر ایک خُدا رسیدہ فقیر نے اُس پیر صاحب کا ظاہری جاہ و جلال دیکھ کر ایک آیت پڑھی جو انسان کو اس سے آگاہ کرتی کہ انسان کے اکڑ کر چلنے سے وہ زمین کا سینہ پھاڑ نہیں سکتا۔یہ آیت سن کر پیر صاحب کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ظاہری دکھاوے کو ترک کر کے متصوفانہ سادگی کو اپنی حیات کا شعار بنا لیتے ہیں۔کہانی کے ایک دوسرے موقع پر جمعدار صاحب دُنیا کو دکھوں کا اور غموں کا جال سمجھ کر جب ترک دُنیا کی بات کرتا ہے تو مولانا مستنصر باللہ اس رسمی تصوف کے عمل کو اپنے الفاظ میں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:

> "(تارک الدنیا ہونا) مسلمان کی شان نہیں ،اس کی تو دنیاوی زندگی بھی عبادت ہے،سانس لینا تک عبادت ہے،عاقبت کی زندگی تب ہی سنورتی ہے جب دُنیا کی زندگی سنورے"۔(۲۳)

ناول میں مثبت صوفیانہ فکر پر ہمدردانہ طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ناول میں متصوفانہ اعمال و افکار کو حرف تنقید کا بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ان تمام باتوں کے باوجود ناول تصوف کی سوچ کو زیر بحث لاتا ہے۔اِس

ناول میں تصوف کی جھلک واضح انداز میں نظر آتی ہے۔

موم کی مریم

"موم کی مریم" محمد یحییٰ خان کا ناول ہے جس میں عام رسمی تصوف بلکہ معاشرے میں موجود متصوفانہ اعمال کی ایک طنزیہ تصویر ہے۔ اس ناول میں عامل ظہوری شاہ سنیاسی بابا اور جمالا تینوں ایک بھیانک گروہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تصوف کی آڑ میں غیر انسانی گھناونا کھیل کھیلتے ہیں۔ اس ناول میں سیناسی بابا کا حلیہ ویدانتی کے بگڑے صوفیاء کا گہرا عکس لئے ہوئے ہے:

> "جٹا دھاری، ناف تک اُتری ہوئی راکھ، بھوبھل ریش، ہڈیوں کی مٹھ، ننگ دھڑنگ لنگوٹی پوش، کاندھے پر جھولتا ہوا پھٹا پُرانا جھولا، ہاتھ میں نرسنگھا، سر بھبھوت، ماتھے کشک، شائد وہ سلفے کی بُو سونگھ کر ادھر آگیا تھا۔ حاضر باش اوباشوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عزت تکریم سے بٹھایا اور جل بھوجن بھنگ کلیان سے تواضع کی کھاپی، ڈکار، آس جما کر دھیان گیان میں مگن ہو گیا"۔ (۲۴)

اس سنیاسی بابا کے حلیے سے رسمی متصوفانہ عناصر کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس ناول میں متصوفانہ اعتبار سے دوسرا اہم کردار ظہوری شاہ کا ہے۔ ناول میں نام نہاد صوفیاء کے حوالے سے اس عنصر کو عیاں کیا گیا ہے کہ صرف مذہب اسلام میں ہی نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے متصوفانہ سلاسل میں ضبط نفس اور ذہنی جھکاؤ کے کئی صوفیاء جنسی اعضاء اور مختلف خصوصیات سے بھی ہاتھ دھو لیتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی شریعت اور حقیقی تصوف میں اس چیز کا سراغ تک نہیں ملتا۔

راجہ گدھ

ناول "راجہ گدھ" میں صوفیانہ رنگ واضح نظر آتا ہے۔ تصوف کے موضوع سے بانو قدسیہ کا خاص لگاؤ ہے۔ آدمی جب اُن تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے تو اُس کو معلوم ہوتا ہے کہ روحانیت کی منزل تک پہنچنے کے لئے صبر و تحمل اور ریاضت کی مسلسل ضرورت ہوتی ہے تب جا کر انسان منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ بامراد ہونے کے لئے کڑی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ روح اور روحانیت کو مد نظر رکھ کر اس ناول میں رزق حلال اور حرام کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔ رزق سے انسان کی روح بھی پریشان اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول دوہری سطح پر سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک طرف لاحاصل عشق سے پیدا ہونے

والے نفسیاتی و ذہنی مسائل ہیں جبکہ دوسری جانب روحانیت، مذہب، کے تناظر میں ان مسائل کی وضاحت بیان کی گئی ہے:

"ناول کی کہانی آفتاب اور سیمی کی محبت پر مبنی ہے تاہم اس کہانی کی محبت دنیاوی تقاضوں سے ہٹ کر روحانیت کی سطح پر سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس محبت کا آغاز اُس وقت ہوتا ہے جب کسی خاص لمحے میں دونوں روحیں ایک ساتھ قید ہو جاتی ہیں۔ آفتاب اُٹھا۔اُس نے اپنے دونوں بازو صلیب کی طرف اُٹھائے، آدھی آستین والی قمیض میں اُس کے دونوں بازو سنہری گھاس سے اٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی سے براؤن آنکھوں میں چمکتے شہد جیسی روشنی پیدا کر رہی تھی اور اُس وقت وہ اولمپک کھیلوں میں آگ کی مشعل اُٹھانے والے کھلاڑی کی طرح خوبصورت ، کنوارہ اور مقدس نظر آرہا تھا۔شائد اُسی لمحے سیمی نے اُس کی طرف دیکھنے کی غلطی کی اور دیوانی ہوگئی"۔[۲۵]

سیمی جب آفتاب کو کھو دیتی ہے تو اُس میں غیب کا علم جاننے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ سیمی کی محبت میں سچائی کا عنصر موجود تھا۔اُس کو آفتاب سے اس قدر محبت تھی کہ اُس پر اپنی ذات کے بارے میں اور کائنات کے بارے میں سارے بھید عیاں ہو جاتے ہیں۔اس طرح وہ مستقبل کے حالات سے بھی باخبر رہنے لگی تھی۔حالات و واقعات سے اُس کو پیشگی آگاہی ہو جاتی اور پھر وہی واقعات حقیقت میں بھی رونما ہو جاتے ہیں۔وہ اس قدر آگاہ ہو جاتی ہے کہ آفتاب کی شادی سے ایک رات پہلے ہی وہ قیوم کو آفتاب کی شادی کے بارے میں آگاہ کر دیتی ہے۔"راجہ گدھ" ناول کا مطالعہ کرنے سے دیوانگی کے مختلف قسم کے محرکات ظاہر ہوتے ہیں۔ان تمام محرکات کا تعلق جسمانی نقائص سے نہیں بلکہ روحانی امراض سے ہوتا ہے۔جب انسان کی روح ،اضطراب ،بے چینی، اور ناآسودگی جیسی کیفیات سے گزر رہی ہوتی ہے تو وہ اپنی انتہا والی سطح پر پہنچ کر انسان کو دیوانگی جیسی صورت حال سے دوچار کر دیتی اور دیوانگی کا ایک خاص محرک عشق لاحاصل ہے۔

" مانے نہ مانے کوئی۔۔۔۔اصل پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔صرف ایک وجہ ،عشق لاحاصل ۔۔۔۔۔عشق لا حاصل ۔۔۔۔عشق لاحاصل"۔[۲۶]

بانو قدسیہ نے ناول " راجہ گدھ " میں جن جن پہلو پر بحث کی ہے اُن میں سب سے الگ اور نایاب پہلو " رزق حرام " کا ہے۔ یہی پہلو اس ناول کا مرکزی موضوع بھی ہے۔ مصنفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حرام رزق سے انسانی سوچ اور فکر پر بہت زیادہ منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے انسان کا ذہن انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر بانو قدسیہ مذہبی نقطہ نظر کے مطابق اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ اسی لئے ہمارے مذہب اسلام نے مردار کو حرام قرار دیا ہے کہ اس سے انسان کے اندر اخلاقی اور روحانی تبدیلیاں رونما ہوتی ہے اور پھر یہی تبدیلیاں دیوانگی کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ ناول "راجہ گدھ" میں تمام کردار حرام رزق کھانے کی وجہ سے دیوانگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ رزق روحانی و جسمانی دونوں طرح کے رزق سے تعلق رکھتا ہے:

> "جو کوئی بھی حرام رزق کھاتا ہے۔ اگر خود دیوانہ نہیں ہوتا تو اُس کے آنے والی نسلیں اس سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔ اس کے لہو کی ساخت کچھ اس طور پر بدلتی ہے کہ بلا آخر دیوانہ پن اس رزق کی وجہ سے اُس کی پشتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے"۔[۲۷]

بانو قدسیہ نے ناول میں دیوانگی کی ایک اور قسم بیان کی ہے۔ یہ اس قسم کی دیوانگی ہے جو رزق حلال اور حرام کے علاوہ تیسرے قسم کے رزق سے پیدا ہوتی ہے۔ جس سے روح کو توانائی حاصل ہوتی ہے اور انسان دیوانگی کی اُس سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں پر کوئی بھی راز پھر راز نہیں ہوتا تمام مخفی چیزیں جو اس کائنات میں ہیں ظاہر ہونے لگتی ہے۔ دیوانگی کی یہ وہ قسم ہے جو خُدا اپنے محبوب اور مخصوص بندوں کو ہی عطا کرتا ہے۔

> "ایک دیوانگی وہ ہے جو انسان کو ارفع و اعلیٰ بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اُوپر اُٹھتا ہے۔ پھر وہ لوگوں سے کٹتا جاتا ہے۔ دیکھنے والے اُسے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اُوپر اُوپر اور اُوپر چلتا ہے۔ حتیٰ کہ عرفان کی آخری منزل یُوں طے کرتا ہے۔ عام لوگ اُسے بھی پاگل سمجھتے ہیں"۔[۲۸]

"راجہ گدھ" ناول میں روحانیت کے حوالے سے اور روح کے حوالے سے بانو قدسیہ کے متصوفانہ خیالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ تصوف کے حوالے سے یہ ناول بہت زیادہ اہمّیت کا حامل ہے۔ محبت کے روحانی اور جذباتی پہلوؤں کو زیر بحث لا کر صوفیانہ عناصر کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکیا اور جولاہا

اکیسویں صدی میں شائع ہونے والا مستنصر حسین تارڑ کا تیسرا ناول ہے۔ ناول ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کی طباعت ۲۰۰۵ء میں ہوئی۔ اس ناول کے بارے یہ رائے بھی ہے کہ یہ ناول " قربت مرگ میں محبت " میں ہونے والے کرداروں کو مزید آگے بڑھایا گیا ہے۔ لیکن " قربت مرگ میں محبت " ناول میں محبت کا تانا بانا اُن افراد کے گرد گھومتا ہے جو بڑھاپے کی چوکھٹ پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس ناول میں ایک مرد اور تین عورتیں ہیں جبکہ ناول "ڈاکیا اور جولاہا" میں ایک سید زادی کا کردار ہے جو کہ خانقاہی روایات میں جکڑی عورت ہوتی ہے۔ فکری مواد اور اسلوب کے حوالے سے اس ناول میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو تارڑ کے پہلے ناولوں میں موجود ہیں۔ "ڈاکیا اور جولاہا" ناول اپنی تھیم اور خیال کی وجہ سے اس لئے مختلف اور منفرد ہے کہ اس میں ڈاکیے اور جولاہے کو باقاعدہ طور پر نظریہ جبر کا نمائندہ بنا کر بیان کیا گیا ہے۔ ناول کی اصل کہانی کا آغاز ڈاکیے کی جبریت کے بعد ہوتا ہے۔ خانقاہی نظام میں جکڑی ہوئی نجیب الطرفین سید زادی کی کہانی ہے جس کو بنیادی تعلیم کے بعد ایک مشنری ادارے میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں پر وہ عیسائی مذہب سے آگاہی حاصل کرتی ہے۔ ناول میں مختلف سیاسی حالات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ مذہب کی آڑ میں استحصال بھی اس ناول کا ایک ضمنی موضوع ہے۔

> " آستانہ رومی سے اُٹھا کر وہ اُسے اُردن لے گیا تھا، جہاں وہ ایک معمولی موٹر مکینک تھا۔ اگرچہ اُس نے "بابا" کو یہی باور کرایا تھا کہ وہ رائل جارڈن ائیر فورس میں گراونڈ انجنیر ہے، بابا اگرچہ دلوں کا حال جانتے تھے لیکن اُن کی پر خلوص عبادت اور روحانیت اُردن پہنچ کر اس بہادر کی اصلیت جاننے سے قاصر تھی"۔[۲۹]

ناول میں دیہاتی زندگی کو بھی خوبصورت انداز میں موضوع بنایا گیا ہے۔ لیکن اس ناول کا سب سے جاندار اور متحرک کردار نتالیہ کا ہے۔ بلند نسب اور خانقاہی نظام کے پس منظر میں پیدا ہونے والی یہ سید زادی اپنی اوئل عمری میں ہی ایک تلاش میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے "بابا" جو کہ حقیقت میں اُس کا دادا ہے۔ دادا کے علاوہ اُس کے بھائی "سوان" کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ نتالیہ کے طویل خطوط بھی ان دو کرداروں کا تذکرہ سب سے زیادہ ملتا ہے۔ بابا جو در حقیقت نتالیہ کا دادا ہے آستانہ رومی پہ گدی نشین ہے۔ یہ ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی گدیوں میں سے ایک ایسی گدی ہے جو کہ خاندانی و روحانی گدی ہے۔ اُس کا "بابا"

گزشتہ کئی سالوں کے عرصے سے اپنی خانقاہ سے باہر نہیں نکلا ہے۔ زندگی کی مشکلات اور مصائب کے باوجود اس کردار میں ایک عروج ہے جو کہ مصنف نے اچھے انداز میں تخلیق کیا ہے۔ بابا کی صاف ستھری زندگی، تصوف اور فلسفے میں رچی بسی زندگی، بین المذہب ہم آہنگی، تعصب سے پاک زندگی، اُس کی فلسفیانہ گفتگو اُس کے صوفی ہونے کی روشن دلیل ہے۔ رودین جو بابا کی لاڈلی ہے وہ اپنے بابا کی داڑھی میں پرندوں کو تلاش کرتی ہے اور وہ اُس کو ایسا کرنے دیتا ہے۔ اس معاملے میں وہ اُس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اُس کو یہ تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنی تلاش کو ساری زندگی جاری و ساری رکھے۔ داڑھی میں پرندوں کی تلاش ایک علامتی حیثیت رکھتی ہے۔

زیر بحث ناول میں کہانی کو ایک منفرد اور نئے خوبصورت پیرائے میں ایک علامتی طرز پر اور مفکرانہ و فلسفیانہ اظہار خیال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بابا کی متصوفانہ گفتگو سے ناول زیادہ دلچسپی کا سبب بنتا ہے جو کہ ایک قاری کے لئے لطف کا سبب بنتا ہے۔

(ہ) حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ اجمالی تعارف

نام و نسب

محمد بن ابی بکر ابراہیم آپ کا اصل نام تھا۔ آپ کی کنیت ابو حامد تھی۔ فرید الدین آپ کا لقب اور عطار تخلص ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ فرید الدین عطار کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ عطار عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے عطر فروش لیکن پرانے زمانے میں اس کے معنی بہت وسیع تھے۔ عطار لفظ دواخانہ، ڈسپنسری اور ہسپتال کے لئے استعمال ہوتا اس کے علاوہ پھولوں کی دُکان کے لئے بھی لفظ عطار ہی استعمال کیا جاتا۔ عطار اس لئے بھی کہا جاتا کہ آپ کے والد ایک قابل ڈاکٹر اور بہترین معالج تھے۔ آپ ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ آپ علم تصوف اور علم اخلاق کے نامور اُستاد تھے۔

پیدائش

آپ ۱۱۴۶ء کو نیشاپور میں پیدا ہوئے جو ایران کے شمال مشرق میں واقع ہے۔

ابتدائی حالات زندگی۔

خواجہ فرید الدین عطار نے بچپن میں قرآن و حدیث پڑھا۔ آپؒ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ اُس کے بعد آپ نے ادویات کا پیشہ اپنایا، دواخانے کا کام اپنے والد سے سیکھا تاکہ اپنے والد

کے کاروبار کو آگے جاری رکھ سکیں۔ آپ کے والد گرامی کا نام ابراہیم بن اسحاق تھا۔ آپ کے والد اولیاء کرام سے محبت کرنے والے تھے۔ آپؒ جب پیدا ہوئے تو آپ کے والد آپ کو ولی کامل قطب الدین حیدر کے پاس لے کر گئے۔ قطب الدین حیدر نے فرید الدین عطار کے لئے دُعا کی۔ خواجہ فرید الدین عطارؒ اور اُن کے والد گرامی سادات کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔ شیخ فرید الدین عطار اپنے کام سے فراغت پا کر اپنا شعر و شاعری کا شوق پورا کیا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے دو لاکھ دو ہزار ساٹھ اشعار تحریر کیے۔ آپ کی شاعری آپؒ کے دُنیا سے جانے کے بعد مشہور ہوئی۔ آپ نے بحیثیت طبیب بھی خدمت خلق کی اور اپنے اس کام کے ساتھ ساتھ تصوف اور تصنیف و تالیف کی طرف بھی متوجہ رہے۔ اُس کے بعد آپ کی زندگی میں ایسا موڑ آیا کہ آپ نے اپنا دواخانہ خیرات میں دے دیا اور درویشی اختیار کر لی۔ شیخ عبد الرحمٰن جامی اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> "ایک روز عطار اپنی دُکان کے کاروبار میں مصروف تھے۔ دُکان کا مال سنبھال رہے تھے اُور روپے پیسے کے اُلٹ پھیر میں مشغول تھے کہ اچانک ایک فقیر آیا اور اُس نے خُدا کے نام پر خیرات کا سوال کیا۔ شیخ اپنے کام میں مصروف تھے فقیر کی صدا پر کان نہ دھرا۔ فقیر نے بگڑ کر کہا کہ دُنیا میں اس قدر انہماک ہے تُو آخر کیسے مرے گا؟ شیخ عطار نے غصہ میں جواب دیا جس طرح تُو مرے گا۔ فقیر نے کہا میں تو اس طرح مروں گا یہ کہہ کر فقیر لیٹ کر کشکول گدائی کو سرہانے رکھا کمبل اوڑھا اور "الا اللہ" کا نعرہ لگایا دیکھا گیا کہ وہ فقیر جاں بحق ہو چکا ہے اور اس دار فانی سے کوچ کر گیا ہے"۔ (۳۱)

شیخ عطارؒ پر اس واقعہ کا بہت زیادہ گہرا اثر ہُوا آپ نے کھڑے کھڑے اپنا دواخانہ خیرات میں لٹا دیا اور خود تارک الدنیا ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ آپ نے طویل المدت سفر اختیار کیا اور اس سلسلے میں کوفہ، بصرہ، بغداد، دمشق، مکہ، مدینہ، ہندوستان، ترکستان وغیرہ جیسے ممالک کا سفر کیا۔ سفر کے دوران آپ کی ملاقات ایسے صوفیاء کرام سے ہوئی کہ آپ نے پھر اُن کی خدمت میں باقاعدہ رہ کر فیض حاصل کیا۔ اس سے آپ کے اندر روحانی انقلاب برپا ہوا۔ آپ کا انداز صوفیاء جیسا ہو گیا اور آپ کی فکر و سوچ میں کافی تبدیلی آئی۔ آپ نے آہستہ آہستہ تصوف و عرفان کے مراحل کو طے کیا۔ مولانا روم جیسے صوفی شعراء آپ کے بارے میں کہتے ہیں: "شیخ عطار عشق و تصوف کے سات شہروں کا سیاح تھا جبکہ ہم ابھی تک ایک ہی کوچہ کے

موڑ پر پھیر رہے ہیں"۔[۳۱] بعض جگہوں پر یہ حوالہ ملتا ہے کہ عرفان و تصوف کی طرف آپ کی طبیعت بچپن سے ہی مائل تھی اور اسی طرح یہی ذوق و شوق اپنے والد سے پروان چڑھتا رہا۔ آپ نے اپنی مشہور کتاب منطق الطیر جوانی کے زمانہ میں تحریر کی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ جوانی کے زمانہ میں بھی تصوف کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ مگر تصوف کی طرف آپ کا مکمل دھیان تب ہوا جب آپ کے والد گرامی اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ تصوف کے بارے میں فرید الدین عطارؒ کے بیان کردہ مسائل زیادہ مشکل نہیں۔ آپ نے بہت آسان اور سادہ زبان استعمال کی۔ آپ بہت عرصہ رکن الدین کی خدمت میں رہے لیکن شیخ جامی نے عطارؒ کو شیخ مجد د الدین بغدادی کا مرید کہا ہے۔ آپ نے شیخ مجد د الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلوک و معارف کا وہ مقام حاصل کیا کہ آپ اپنے پیر و مرشد کے لئے باعث فخر بنے۔ مولانا روم جن کو شیخ جلال الدین رومی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپؒ بچپن میں شیخ فرید الدین عطارؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اُس وقت عطارؒ نے اپنا رسالہ " اسرار نامہ " اُن کو پیش کیا تھا۔

تصنیفات

نظم و نثر میں آپ نے بہت سی کتب تحریر کیں۔ ایک روایت کے مطابق آپؒ کی کتب کی تعداد ۴۰ ہے لیکن بعض روایات کے مطابق ۴ ہے لیکن آپ کی مشہور تصنیفات یہ ہیں۔

1۔ جواہر نامہ

۲۔ الٰہی نامہ

۳۔ مصیبت نامہ

۴۔ اسرار نامہ

۵۔ پند نامہ

۶۔ وصیت نامہ

۷۔ دیوان

۸۔ خسرو نامہ

۹۔ شرح القلب

۱۰۔ بلبل نامہ

۱۱۔ مختار نامہ

۱۲۔ حیدر نامہ

۱۳۔ معراج نامہ

۱۴۔ تذکرۃ الاولیاء

۱۵۔ منطق الطیر

تذکرۃ الاولیا اور منطق الطیر آپ کی شہرہ آفاق تصانیف ہیں جن کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ مثنوی منطق الطیر چار ہزار چھ سو اشعار پر مشتمل ہے اس مثنوی کا مرکزی موضوع ہی عرفان و اخلاقیات ہے۔ "منطق الطیر" شیخ فرید الدین عطار کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ کتاب میں تصوف کے مسائل کو تمثیل کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ عطارؒ نے مثنوی "منطق الطیر" میں پرندوں کے ذریعے اپنے حقیقی بادشاہ کی تلاش میں موثر انداز میں سیر و سلوک کی رائیں متعارف کرائی ہیں۔ یہ پرندے اپنے بادشاہ کی تلاش میں عشق کی سات وادیاں عبور کرتے ہیں۔ طلب، عشق، معرفت، استغناء، توحید، حیرت، فنا یہ وہ سات وادیاں جن کو یہ پرندے اپنے رہبر "ہدہد" کی رہنمائی میں پار کرتے ہیں تاکہ اپنے اصل بادشاہ کو پا سکیں۔

شہادت کا واقعہ

شیخ عطارؒ کی وفات کے بارے میں مختلف اقوال بیان کیے جاتے ہیں لیکن تذکرہ نگاروں نے آپ کی وفات کے بارے میں کچھ اس طرح لکھا ہے:

> "تاتاریوں کے عین ہنگامے میں ایک سپاہی نے شیخ کو گرفتار کیا، ایک راہ گیر نے بڑھ کر کہا دیکھنا اس مرد ضعیف کو قتل نہ کر دینا، دس ہزار اشرفیاں نقد دیتا ہوں کہ ان کو چھوڑ دو۔ شیخ نے کہا کہ خبردار! اتنے پر مجھے فروخت نہ کر دینا میری اس سے کہیں زیادہ قیمت ہے۔ سپاہی خوش ہوا کہ اس سے بھی زیادہ دولت ہاتھ آئے گی اور وہ بھی بالکل مفت۔ آگے بڑھ گیا آگے ایک اور شخص ملا۔ اُس نے کہا کہ میاں سپاہی اس بوڑھے کو مجھے دے ڈالو میں ایک گٹھا گھاس کا اس کے معاوضے میں دیتا ہوں، شیخ بولے ہاں دے ڈال کہ میری قیمت اس سے بھی کم ہے۔ سپاہی کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ دس ہزار اشرافیاں ملتی ہوئی ہاتھ سے گئیں۔ جھلا کر وہیں سر تن سے جُدا کر ڈالا"۔[32]

قاضی یحیٰ نے آپ کی قبر کو پختہ کیا لیکن اُس سے پہلے قاضی یحیٰ آپ کے خلاف تھے۔ کہتے تھے کہ عطار ایک کہانی نویس ہے۔ یہ ایک کہانی گو بابا ہے۔ بعد میں جب قاضی یحیٰ کا بیٹا فوت ہوا تو اُس کو فرید الدین عطارؒ کے قدموں میں دفنایا گیا تو کراماتی طور پر قاضی یحیٰ شیخ عطار کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ پھر قاضی یحیٰ نے نہ صرف آپ کی قبر کو پختہ کیا بلکہ آپ کے نام کا باقاعدہ کتبہ بھی لگوایا۔ کافی عرصے کے بعد علی شیر نوائی نے سلطان حسین مرزا کے عہد میں ایک بلند مزار بنوایا جو کہ نیشا پور ایران میں ایک عظیم شاہکار ہے۔ آپ کا مزار نیشاپور سے ۶ کلو میٹر کے فاصلے پر مغرب کی طرف واقع ہے۔ عمر خیام کا مقبرہ بھی آپ کی قبر کے پاس ہے۔

مثنوی کا تعارف

منطق الطیر فارسی ادب کی ایک بے مثال مثنوی ہے جو کہ تصوف و عرفان کے موضوع پر مبنی ہے۔ اس مثنوی میں سیر و سلوک کے مختلف مراحل بتائے گئے ہیں۔ تاکہ لوگ ان مراحل پر چل کر حقیقت کو پا سکیں۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے جو کہ تقریباً چار ہزار چھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کو انتیس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے مثنوی کے بعد حصوں کو روایتی انداز اور بیشتر مطالب کو جانوروں کی زبان مین واضح کیا گیا ہے۔ مثنوی منطق الطیر کا مرکزی موضوع عرفان و اخلاقیات ہے۔ سب سے اہم اور دل چسپ حکایت جو کہ تمثیلی انداز میں بیان کی گئی ہے وہ اُن پرندوں کی ہے جو ہُدہُد پرندہ کی رہبری میں اپنے حقیقی بادشاہ کی تلاش میں مختلف دشوار گزار وادیوں میں سے گزرتے ہیں۔ مثنوی کا پہلا باب " التوحید باری تعالی" دوسرا باب " نعت رسول ﷺ" اور تیسرا باب" فضائل خلفاء" اور پھر اس کے بعد آغازِ کتاب کے عنوان سے مثنوی کا اہم باب شروع ہوتا ہے اس مثنوی میں پرندے انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں فرید الدین عطار نے اس مثنوی میں بہت معنی خیز بات کی ہے کہ بغیر رہبر کامل کے حقیقت و طریقت کا راستہ طے کرنا نہایت کٹھن ہے اس لیے پرندے اپنے سفر کی ابتداء کرنے سے پہلے اپنے لیے ہُدہُد کو اپنا رہبر تسلیم کرتے ہیں۔ سبھی پرندے اکٹھے ہو کر اپنی بغیر بادشاہ کے مملکت کا گلا کرتے ہیں اور اس بادشاہ کی تلاش کا ارادہ کرتے ہیں اس پر ہُدہُد بادشاہ کے بارے میں یوں جانکاری دیتا ہے کہ بے شک ہمارے مملکت کا بھی ایک بادشاہ ہے اس کا نام سیمرغ ہے وہ پرندوں کا بادشاہ ہے وہ ہمارے کے قریب ہے لیکن ہم اس دور ہیں مثنوی میں خواجہ فرید الدین عطار نے کچھ خاص پرندوں کے نام بھی لیے ہیں جن میں فاختہ، بٹیر، مرغ، بطخ اور بگلہ وغیرہ شامل ہیں۔

عطار نے ہدہد کی رہنمائی میں تمام پرندوں کو سات وادیوں سے روشناس کرایا ہے ان وادیوں میں سب سے پہلی

وادی کا نام وادیِ طلب ہے۔

وادی طلب

کسی چیز کو پانے کیلئے حاصل کرنے کیلئے" طلب" جذبہ پختہ ہونا چاہیے طلب کا جذبہ جس قدر قوی ہو گا منزل تک رسائی زیادہ آسان ہو گی راہ سیر و سلوک پر چلنے والے کیلئے طلب سے آگے کی منزل وادی عشق ہے۔

وادی عشق

وادی عشق وہ سخت وادی ہے کہ جس میں جب کوئی داخل ہو جاتا ہے تو اس بہت ہی مشکل امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے اس لیے سالک کو مطلوبہ منزل تک پہنچے کیلئے اس قدر دلی وابستگی ہو کہ پھر اس کو کسی مشکل سے واسطہ نہ پڑے وہ نڈر اور بے باک مجاہد کی طرح آگے بڑھتا رہے۔ اس وادی کی مصیبتوں کو جس نے بخوبی برداشت کیا وہ کامیاب ہو کر راہ وسیر سلوک کی تیسری وادی یعنی وادی معرفت میں داخل ہو جاتا ہے۔

وادی معرفت

جس کا عقل و شعور جس قدر بلند ہو گا اس کو اتنا زیادہ معشوق کا عرفان حاصل ہو گا یہ وادی سالک عقل کے مطابق موافق ہوتی ہے۔ اس وادی کیلئے ایسا مرد کامل ہونا چاہیے جو بحر عرفان کا شناور ہو۔ جس عاشق کو اپنے معشوق کی معرفت حاصل نہ ہو وہ اپنے محبوب سے محروم ہو جاتا ہے الغرض جب سالک کو اپنے حقیقی محبوب کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر وادی معرفت سے آگے "وادی استغنا" داخل ہو جاتا ہے۔

وادی استغنا

استغنا سے مراد بے نیازی، بے پرواہی، بے غرضی، دنیا اور اس کی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا ضروریات کی فکر نہ ہونا قناعت و توکل۔ سلوک کی منزل ہے جہاں پہ سالک جب پہنچ جاتا ہے تو وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے اس کے سامنے ماسوائے ذات حق کے ہر چیز زیر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سالک اگلی وادی میں قدم رکھتا ہے جو کہ "توحید وادی" کہلاتی ہیں۔

وادی توحید

یہ ایسی وادی ہے کہ جہاں پر سالک کو ہر چیز میں حق تعالیٰ کی ذات نظر آتی ہے سالک کو کثرت میں وحدت نظر

آتی ہے اور جب سالک ہر چیز میں صرف وہ ہی حق تعالیٰ کی ذات کو دیکھتا ہے تو اپنے آپ میں بھی اسی ذات کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اس کے لیے من وتُو کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

وادی حیرت

اس وادی میں سالک حقیقت سے آشنائی حاصل کرتا ہے اور بے خودی و آوارگی کی حالت میں گھومتا ہے لیکن یہ آوارہ گردی ویسی نہیں کہ جس طرح بعض افراد فقیر کی شکل میں گھومتے رہتے ہیں الغرض یہ وہ مقام ہ ہے کہ سالک کی ساری لاعلمی اور جہالت کا بھید عیاں ہو جاتا ہے اور اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ علم کے باوجود جاہل مطلق تھا۔

وادی فنا

وادی فنا پہنچ کر سالک مکمل طور پر روحانی و جسمانی قسم کی کدورتوں سے جیسے غرور و تکبر، خود نگری و خود پرستی وغیرہ سے پاک ہو جاتا ہے۔ تمام برائیاں اُس سے دور ہو جاتی ہیں اور اُس کا وُجود عالم وحدت کا حصہ بن جاتا ہے جب سالک فنا فی اللہ ہو جاتا تو وہ ید اللہ کہلاتا ہے بظاہر زبان سالک کی ہوتی ہے لیکن لسان اللہ کہلاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں پر جب سالکین نے پہنچ کر جب انا الحق کا نعرہ لگایا تو اُن کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔
اس سیر وسلوک کو خواجہ فرید االدین عطار نے مثنوی میں پرندوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے جس میں پرندے اُن سات سخت ترین وادیوں سے گزرتے ہیں لیکن گمراہ ہو جاتے ہیں آخر کار تیس پرندے آخری مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے جب آخری وادی میں سیمرغ کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں تو وہاں اُنے سیمرغ کے ''سی مرغ'' یعنی کے اپنا عکس ہی نظر آتا ہے سی مرغ و تیس پرندے جس حقیقت کو حاصل کرنا چاہتے تھے دراصل وہ حقیقت اُن کے اندر موجود تھی جب انہوں نے اپنے من سے کدورتوں کو پاک کیا تو وہ حقیقت ظاہر ہو گئی جس کی وہ تلاش میں یہ کٹھن سفر کرتے ہیں۔

(و) مستنصر حسین تارڑ اجمالی تعارف

مستنصر حسین تارڑ کا نام اُردو ادب میں کوئی نیا نام نہیں۔ اُن کا شمار ہمہ جہت ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اُردو ادب کی کئی اصناف میں اپنے فن کو آزمایا ہے۔ وہ ایک مشہور سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، کالم نگار اور ناول نگار ہیں۔ اُن کی تصانیف اُردو ادب میں اہم تخلیقی نثری اور ادبی سرمائے میں شمار ہوتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا شمار عصر حاضر کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اُن کے سفر نامے اور ناول

لوگوں میں بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر کیا گیا ہے۔

پیدائش

مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ ۱۹۳۹ء کو لاہور شہر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام چودھری رحمت علی خان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ تمام بہن بھائیوں سے بڑے ہیں۔ جب مستنصر حسین تارڑ پیدا ہوئے تو اُن کی پیدائش کی خبر ایک خط کے ذریعے اُن کے دادا اور دادی کو دی گئی جو کہ اُس وقت گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ اس حوالے سے خود تارڑ بتاتے ہیں۔

> "میرے دادا کھیتوں کا کام کاج کر کے جب گھر میں داخل ہوئے تو دادی نے دادا کو میری پیدائش کی خبر سنائی اُنہوں نے اپنی پگڑی اُتار کر صحن میں بچھا دی اور کہا سارے گاؤں کو اطلاع دے دو کہ میرے ہاں پوتا ہوا ہے اور یہ پگڑی میں نے مبارکبادیں جمع کرنے کے لئے بچھائی ہے"۔[۳۳]

دادی کی خواہش تھی کہ پوتے کا نام لعل خان رکھا جائے لیکن آپ کے ماموں جان نذیر حسین چیمہ عباسی خلیفہ مستنصر سے بہت متاثر تھے۔ اس بناء پر آپ کے ماموں نے اپنے بھانجے کا نام مستنصر حسین تارڑ رکھا۔

خاندانی پس منظر

مستنصر حسین تارڑ کے خاندان کا تعلق مشہور قصبہ جو کالیاں سے تھا۔ جو کالیاں قصبہ پہلے ضلع گجرات میں تھا لیکن اب تحصیل پھالیہ ضلع منڈی بہاؤالدین کا حصّہ ہے۔ اُن کا تعلق جاٹ (تارڑ) برادری سے تھا۔ کاشت کاری اُن کا خاندانی پیشہ تھا۔ اُن کے والد کا نام چودھری رحمت علی تارڑ ہے جن کی تعلیم تو میٹرک تک تھی لیکن عمر بھر اُن کو لکھنے پڑھنے کا شوق برقرار رہا۔ چودھری رحمت علی خان نے ۱۹۲۸ء میں تلاش معاش کے لئے لاہور شہر کی طرف ہجرت کی۔ پھلوں اور سبزیوں کے بیجوں کی خرید و فروخت کا کام شروع کیا اور گو المنڈی کے علاقے میں "کسان اینڈ کمپنی" کے نام سے دکان کھول لی۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے والد محترم کی دلکش شخصیت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ میرے والد چودھری رحمت علی تارڑ کا تعلق جاٹ برادری سے تھا اور وہ اپنے گاؤں کے پہلے شخص تھے جنہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اُنہوں نے لاہور میں اپنا کاروبار شروع کیا۔ اگرچہ وہ زیادہ مذہبی نہیں تھے لیکن نیکی کرنا اُن کو شیوہ تھا۔ ۸۵ سال کی عمر تک اُن کے مُنہ سے میں نے سب سے بڑی گالی یہ سُنی کہ تُو بڑا اُلو ہے۔ وہ اس سے آگے کبھی نہیں گئے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا

ہوں کہ میرے والد نے مجھے اپنی زندگی میں کبھی نہیں مارا۔ وہ بچوں کو سزا دینا معیوب سمجھتے تھے، اُنہوں نے مجھے ہر معاملے میں مکمل آزادی دی۔ میں چھٹی جماعت میں منٹو، بیدی، بلونت سنگھ، ایم اسلم جیسے ادیبوں کے رسائل اور ناول پڑھا کرتا تھا۔ والد صاحب نے مجھے کبھی منع نہیں کیا۔ وہ مجھ پر اعتماد کرتے تھے۔ میں اُن کی طرف سے جتنا آزاد تھا اُس کے بدلے میں میں اُتنا ہی ذمہ دار فرد تھا۔ چاہتا تھا کہ میں اپنی کسی حرکت سے اپنے والد کو کبھی مایوس نہ کروں۔ اس لئے میں دوسرے بہن بھائیوں سے زیادہ ذمہ دار تھا۔ مثال کے طور پر وہ ابھی زندہ تھے اور میں تقریباً جوان ہو چکا تھا۔ تب بھی میں اُنہیں اطلاع کر کے جاتا تھا کہ میں گھر سے باہر جا رہا ہوں اور اتنے بجے واپس آجاؤں گا۔ جن دنوں والد صاحب بیمار تھے ایک دن اُن کی طبیعت تھوڑی زیادہ خراب تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ زیادہ تکلیف میں ہیں۔ میں نے اُن کی چارپائی کے ساتھ دیوار پر ہاتھ رکھا۔ میں نے دُعا کی کہ یا اللہ تو جانتا ہے کہ یہ بندہ فرشتوں سے کم نہیں ہے اور اس نے ساری عمر دُنیا میں کسی کو دکھ نہیں دیا یا تو اس بندے کو صحت یاب کر دے یا پھر اِس کی مشکل آسان فرما دے۔ اِس دُعا کے دس منٹ بعد والد صاحب فوت ہو گئے۔ میرے والد ایک نیک دل انسان تھے۔ اُن کے پاس جو بھی بیٹھتا تھا وہ ایک بہتر انسان بن کر اُٹھتا تھا۔ وہ مجھے اکثر اس بات کی نصیحت کیا کرتے تھے کہ تمھارے ہاتھ سے مخلوق خُدا میں کسی کو بھی دُکھ نہ پہنچے۔۔۔ میری بیوی اکثر یہ بات کہتی ہے:

> "میرے والد کے بعد تمھارے والد تھے جنہوں نے مجھے محبت دی اور میں نے اُن سے بڑا انسان نہیں دیکھا اور ہمیشہ یہ کہتی ہیں کہ تم میں اُن کی خصلتیں کیوں نہیں آئیں"۔ (۳۴)

مستنصر حسین تارڑ اپنے والد محترم سے بہت متاثر تھے۔ اُن کے والد بھی مستنصر حسین تارڑ کی آئیڈل شخصیات میں شامل تھے۔ اُنہوں نے کئی تخلیقات میں بھی اپنے والد محترم کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک اور جگہ اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ابّا جی کاروبار سے لوٹتے، تھکے ماندے اور نڈھال فیلٹ ہیٹ اُتار کر سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے، سوٹ ہمیشہ تھری پیس زیب تن کرتے اور صرف ہنکن ٹیلر سے سلواتے۔ شوز اُنہیں چینی ہاپسن کے پسند ہوا کرتے تھے ۔۔۔ وہ گھر پہنچتے ہی ٹائی سمیت اُن تمام اشیا سے نجات حاصل کر لیتے ۔ ایک الانی چارپائی پر بیٹھ جاتے، جس پر امّی جان نے اگر کوئی چادر یا کھیس وغیرہ

بچھایا ہوتا، تو وہ اُسے اٹھوا دیتے کہ اُن کے نزدیک الانی بان کی چارپائی کی
نسبت اُن کے تھکے بدن کو بھاتی تھی"۔(۳۵)

والد کے ساتھ ساتھ والدہ سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ مستنصر حسین تارڑ کی والدہ کا نام نواب بیگم تھا جن کا تعلق گکھڑ منڈی کے چیمہ خاندان سے تھا۔ اُن کا خاندان جب لاہور منتقل ہُوا تو پہلے چیمبر لین روڈ پر واقع ایک وسیع مکان میں رہائش ہوا بعد میں یہ خاندان ہال روڈ کے کارنر کی طرف شفٹ ہو گیا۔ اس مکان میں مستنصر حسین تارڑ کو معراج خالد، خورشید شاہد، سعادت حسن منٹو اور عائشہ جلال کی ہمسائیگی حاصل ہوئی۔ بعد میں تارڑ کا خاندان اپنے تعمیر کردہ مکان ۲۲ جے گلبرگ تھری میں منتقل ہو گیا۔

بچپن لڑکپن

مستنصر حسین تارڑ کا بچپن مختلف شہروں میں گزرا کیونکہ آپ کے والد کاروبار کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہتے رہے۔ اپنے بچپن کے بارے میں ایک واقعہ سناتے ہیں:

"کم سنی کے زمانے میں میں نے گھر میں رکھی بہت سی چوہے مار گولیاں کھا
لیں۔ میرے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور میں بے ہوش ہو چکا تھا، والدہ کی
اچانک نظر پڑ گئی اُنہوں نے مجھے غیر ارادی طور پر گرائپ واٹر پلایا والدہ کا یہ
اقدام بہت مفید ثابت ہوا۔ مجھے بہت زیادہ قے آ گئی اور معدہ زہر کے اثر
سے پاک ہو گیا اور میں موت کے منہ میں جانے سے محفوظ رہا"۔(۳۶)

مستنصر حسین تارڑ کا بچپن لڑکپن بہت اچھے انداز میں گزرا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جس سے اُن کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

تعلیم

مستنصر حسین تارڑ نے اُس وقت کے مشہور سکول رنگ محل مشن ہائی سکول میں داخلہ لیا اور یہاں سے پہلی اور دوسری جماعت پاس کی۔ والد کے کاروبار کے سلسلہ میں گکھڑ منڈی کی طرف مکان لیا تو نارمل سکول گکھڑ منڈی سے تیسری اور چوتھی کا امتحان پاس کیا۔ جب دوبارہ لاہور شفٹ ہوئے تو اُنہوں نے رنگ محل مشن ہائی سکول میں دوبارہ داخلہ لیا اور یہاں سے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ مسلم ہائی سکول لاہور میں چھٹی جماعت کے لئے داخلہ لیا اور یہاں سے ۱۹۵۴ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ابھی انٹر میڈیٹ کر ہی رہے تھے کہ والد محترم نے ہوزری ٹیکسٹائل ڈپلومہ کے لئے انگلستان روانہ کر دیا۔ اُن

کے والد کی خواہش تھی کہ بیٹا بیرسٹر بنے لیکن اُن کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ ٹیکنیکل کالج نوٹنگھم میں دو سالہ ٹیکسٹائل کورس میں داخلہ لیا۔ لندن میں قیام کے دوران بیشتر حصّہ آوارہ گردی میں بھی گزرا۔ مستنصر حسین تارڑ کا ارداہ تھا کہ وہ انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کر لیں مگر ایک دن اپنے والد کا خط اُن کو موصول ہوا کہ وہ پاکستان واپس آکر کاروبار میں اُن کی معاونت کریں، وطن واپس آگئے اور اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا لیکن سیاحت کا شوق تھا اور ۱۹۶۹ء میں دوبارہ سترہ ممالک کی سیر و سیاحت کے لئے براستہ سڑک روانہ ہوئے۔

ازدواجی زندگی

مستنصر حسین تارڑ کی شادی ماں باپ کی طرف سے طے ہوئی۔ منگنی اور نکاح ہو جانے کے باوجود ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا اور نہ ہی کبھی کوئی ملاقات ہوئی۔ اپریل ۱۹۷۰ بروز اتوار اُن کی شادی میمونہ بیگم سے ہوئی۔ میمونہ بیگم کا تعلق راجپوت فیملی سے تھا۔ اُن کے والد کا نام چودھری عبد الرحمن خان تھا۔ میمونہ بیگم ایک گھریلو عورت ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی شریک حیات کے حوالے سے اپنی ایک تحریر میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

> "میری بیگم ایک ایسا کمپیوٹر ہے، جس میں میری ذات کے حوالے سے ڈیٹا فیڈ ہو چکا ہے۔ میں نے برسوں پہلے جو بات کی ہو۔۔۔ کسی خواہش میں آہ بھری ہو۔۔۔ کسی ندی کے پار جانے کا سوچا ہو۔ کسی نا آسودگی کا اظہار کیا ہو۔۔۔ شکایت کی ہو۔۔۔ بحث کی ہو۔۔۔ کسی فون کا انتظار کیا ہو، یہ سب کچھ اس میں فیڈ ہو کر محفوظ ہو چکا ہے"۔[۳۷]

اولاد

مستنصر حسین تارڑ کو اللہ تعالٰی نے دو بیٹے اور ایک بیٹی عطا فرمائی۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام سلجوق تارڑ ہے جو کہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے پاکستان فارن سروس میں ملازمت کر رہے ہیں۔ دوسرے بیٹے کا نام سمیر تارڑ ہے جو کہ کسٹمز کے محکمے میں ایک اعلٰی عہدے پر فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ بیٹی قراۃ العین جو کہ پیشے کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہے جو کہ اب شادی کے بعد امریکہ میں مقیم ہیں۔

مشاغل اور خصوصی دلچسپیاں

مستنصر حسین تارڑ کے مشاغل میں سب سے اچھّا مشغلہ مطالعہ ہے اس کے علاوہ سیاحت، مصوری، اور زرعی شعبے میں خاص دلچسپی ہے۔ موسیقی سے خاص لگاؤ ہے لیکن مخصوص پسندیدہ گلوکار نہیں۔

پسندیدہ ادیب

مستنصر حسین تارڑ ناول نگاری کے حوالے سے سب سے زیادہ جس سے متاثر ہے وہ ٹالسٹائی ہے۔ وہ ٹالسٹائی کو اپنا ادبی مرشد مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلسطین کے محمود درویش، ترکی کے یاشر کمال، مصر کے نجیب محفوظ، فرانس کے سارتر، کافکا، اور کامیو اُن کے پسندیدہ ادیب ہیں۔

اُردو شعراء میں مجید امجد، غالب، رسا چغتائی، انور شعور، احسان دانش، محمد اظہار الحق اور فیض احمد فیض کو بہت پسند کرتے ہیں۔ قراۃ العین کو وہ اُردو ادب کی سب سے بڑی نثر نگار سمجھتے ہیں۔ ممتاز مفتی، منٹو، اور بیدی بھی اُن کے پسندیدہ ادیبوں میں ہیں۔

ذریعہ معاش

مستنصر حسین تارڑ اپنی شادی سے پہلے ٹی۔وی کے مختلف ڈراموں میں اداکاری کرتے رہے۔ ایک اندازے کے مطابق چار سو ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے لیکن شادی کے بعد اداکاری کو خیر آباد کہہ کر باقاعدہ کیمیرنگ کا آغاز کیا۔ پاکستان ٹیلی وژن میں بطور مرکزی اینکر پرسن اُن کا انتخاب ہوا۔

کالم نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی اور "مشرق اخبار" میں تقریباً آٹھ سال تک کالم نگاری کرتے رہے۔ اس کے علاوہ روز نامہ "جناح" اور " اخبار جہاں" میں بھی کالم لکھتے رہے، آج کل روزنامہ " ۹۲ نیوز" میں باقاعدگی سے اپنا کالم لکھتے ہیں۔

ادبی سفر کی ابتداء

مستنصر حسین تارڑ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۸ء سے کیا اور ہفتہ وار رسالہ " قندیل" سے کیا۔ اس رسالے میں اُن کا مشہور ترین سفر نامہ " لندن سے ماسکو تک" سلسلہ وار شائع ہوتا رہا۔ اُس کے بعد ۱۹۷۱ء میں اُن کا پہلا سفر نامہ "نکلے تیری تلاش میں" کتابی شکل میں شائع ہوا اور اس طرح ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز سفر نامے سے ہوا۔ مستنصر حسین تارڈ نے جدید سفر نامے کو متعارف کرایا۔ اس ضمن میں فرزانہ سید لکھتی ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ سفر نامہ نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، کالم نویس اور ٹیلی ویژن کے اداکار کی حیثیت سے ادبی، ثقافتی، اور صحافتی دُنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، لیکن مستنصر حسین تارڑ کو جدید سفر نامہ نگاری کا بانی کہا جاتا ہے"۔(۳۸)

اُن کا سب سے دل کش اور معروف سفر نامہ "خانہ بدوش" ہے اس کے علاوہ اُن کے سفر نامے "ہنزہ داستان" کو بھی بہت زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کو عوام میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی جو کہ اُن کی مقبولیت کا سبب بنی۔

پسندیدہ شخصیات

رسول پاک ﷺ اُن کی پسندیدہ شخصیت ہیں۔ اُن کو بابا قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ والد محترم بھی اُن کی پسندیدہ شخصیت ہیں۔ انصار برنی، عبد الستار ایدھی، پروفیسر احمد رفیق اُن کی دیگر پسندیدہ شخصیات میں شامل ہیں۔

اعزازات

مستنصر حسین تارڑ نے ادبی دُنیا میں اور میڈیا پر جو بہترین خدمات سر انجام دیں اُن خدمات کے اعتراف میں اُن کو ۱۹۹۲ء میں "صدارتی تمغہ حسن کارکردگی" سے نوازا گیا۔ شہرہ آفاق ناول "راکھ" کی مقبولیت کی وجہ سے ۱۹۹۸ء میں "وزیر اعظم ادبی ایوارڈ" دیا گیا۔ اس کے بعد صدر کے ہاتھوں اکادمی ادبیات پاکستان کا ہجرۃ ایورڈ سے نوازا گیا۔ اُن کی صحافتی اور ادبی خدمات کو بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُنھیں مجلس فروغ اُردو ادب دوحہ (قطر) کی طرف سے سلیم جعفری ایورڈ ۲۰۰۳ء میں دیا گیا۔ اس کے علاوہ اُنھیں العمرا آرٹس کونسل لاہور کے بورڈ آف گورنر کی رکنیت ملی۔

مستنصر حسین تارڑ نے نیپال اور کھٹمنڈو میں منعقد ہونے والے "یونیسف سیمینار" میں پاکستان کی طرف سے نمائندگی کی۔

تصانیف

مستنصر حسین تارڑ کی اگر تصانیف پر بات کریں تو اُنہوں نے نثری اور خاص طور پر افسانوی ادب میں بہت سے فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ بلحاظ اصناف اُن کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سفر نامے

مستنصر حسین تارڑ سیاحت کا بہت ہی زیادہ شوق رکھتے ہیں۔ بلاشبہ اُن کو اردو زبان کے لحاظ سے جدید سفر نامہ نویسی کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ سفر نامہ ایک بیانیہ صنف نثر ہے اور سفر نامہ حقیقتاً پرانی روداد نویسی ہے۔ جس میں ایک لکھاری اجنبی سرزمین کی سیاحت کا احوال اپنی سرگزشت میں بیان کرتا ہے۔

معروف ادبی مورخ ڈاکٹر انور سدید سفر نامے کی تعریف کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "سفر نامہ، سفر کے اثرات حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے، فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دورانیا اختتام پر اپنے مشاہدات کیفیات اور قلبی واردات سے مرتب کرتے ہیں"۔[۳۹]

مستنصر حسین تارڑ نے مختلف خو بصورت علاقوں کی سیاحت کرکے اُن پر سفر نامے تخلیق کیے اور پاکستان کے علاقوں کی خو بصورتی کو متعارف کروایا۔ اُن کے سفر ناموں کی تعداد اکیس ہے جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

۱۔ نکلے تیری تلاش میں
۲۔ اندلس میں اجنبی
۳۔ خانہ بدوش
۴۔ نیپال نگری
۵۔ پتلی پیکنگ کی
۶۔ ہنزہ داستان
۷۔ کے۔ ٹو کہانی
۸۔ سفر شمال کے
۹۔ بلتستان داستان
۱۰۔ سنولیک
۱۱۔ پاک سرائے
۱۲۔ چترال داستان
۱۳۔ شمشال بے مثال

۱۴۔ برفیلی بلندیاں

۱۵۔ دیوسائی

۱۶۔ رتی گلی

۱۷۔ سنہری اُلو کا شہر

۱۸۔ غار حرا میں ایک رات

۱۹۔ منہ ول کعبے شریف

۲۰۔ نیویارک کے سو رنگ

۲۱۔ ماسکو کی سفید راتیں

ناول

مستنصر حسین تارڑ نے تخلیقی نگارشات کی ابتداء تو سفر نامے کی صنف سے کیا اور سفر نامے میں اپنا کامیاب رنگ جمانے کے بعد اُن کی توجہ ناول نگاری کی طرف ہوئی۔ اُنہوں نے اُردو زبان کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان میں بھی ناول تحریر کیے۔ اُن کے بعض ناول ایسے ہیں کہ جن پر سفر نامے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ جس طرح کے ناول "جپسی" اس طرح تخلیق ہوا کہ یہ ناول کم اور سفر نامہ زیادہ لگتا ہے۔ اُن کے ناولوں کے عنوانات ذیل میں دیئے گئے ہیں۔

۱۔ پرندے

۲۔ پیار کا پہلا شہر

۳۔ جپسی

۴۔ فاختہ

۵۔ پکھیرو

۶۔ دیس ہوئے پردیس

۷۔ بہاؤ

۸۔ راکھ

۹۔ قربت مرگ میں محبت

۱۰۔ قلعہ جنگی

۱۱۔ڈاکیااور جولاہا

۱۲۔خس وخاشاک زمانے

۱۳۔اے غزال شب

۱۴۔منطق الطیر جدید

مستنصر حسین تارڑ نے جس "افسانوی ادب" کی طرف کم توجہ دی وہ صنف افسانہ ہے۔افسانہ کہانی کو بیان کرنے کا ایک بنیادی فن ہوتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ کے دو افسانوی مجموعے "سیاہ آنکھ میں تصویر" اور دوسرا"۵ کہانیاں" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔پہلے مجموعے میں افسانوں کی تعداد سولہ ہے اور دوسرے مجموعے پندرہ افسانے شامل ہیں۔پہلے افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں کے نام ذیل میں درج کیے گئے ہیں۔

۱۔کوٹ مراد

۲۔آکٹوپس

۳۔درخت

۴۔بابا بگلوس

۵۔آدھی رات کا سورج

۶۔پارک شائر کی گائے

۷۔سیاہ آنکھ میں تصویر

۸۔ٹائم مشین

۹۔ذات کا قتل

۱۰۔بادشاہ

دوسرے افسانوی مجموعے میں کہانیاں شامل ہے۔اُن کے عنوانات یہ ہیں۔

۱۔پھولوں والی پہاڑی

۲۔ایک سنو ٹائیگر کی سرگزشت

۳۔دھند کے پیچھے شہر تھا

۴۔جوہڑ میں ڈوب چکی لڑکی

۵۔ یہ کہانی کون لکھ رہا ہے

۶۔ آرٹ گیلری اور بیتھوون کی چاندی راتیں

۷۔ اے میرے ترکھان

۸۔ اُن کی مائیں بھی روتی ہیں

۹۔ جلد ہے جسم جہاں

۱۰۔ ایک گونگے کی ڈائری

۱۱۔ مکوڑے دھک مکوڑے

۱۲۔ اسکوٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھی لڑکی جو ہنس دی تھی۔

ڈرامے

مستنصر حسین تارڑ نے ڈرامہ نگاری کے حوالے سے بہت شہرت پائی۔ اُنہوں نے دونوں زبانوں اُردو اور پنجابی میں ڈرامے لکھے۔ مشہور ڈراموں کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

۱۔ ہزاروں راستے

۲۔ سورج کے ساتھ ساتھ

۳۔ شہپر

۴۔ مورت

۵۔ پرواز

۶۔ کالاش

۷۔ صاحب سرکار

جہاں اُنہوں نے ڈرامے لکھے ہیں وہیں پر کئی ڈراموں میں مستنصر حسین تارڑ نے کمال اداکاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔

کالم نویسی

مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات سے وابستہ رہے۔ اُن کے اکثر کالموں میں سماجی، سیاسی، اور اقتصادی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے دلچسپ

عنوانات سے کالم تحریر کیے، جیسے:

" اُداس کلچے"، "شوہر برائے فروخت"، "اگر مگر مچھ"،"آنٹیاں ہی آنٹیاں"،"تارڑ اور تربوز"،"اُلو ہمارے بھائی ہیں"،" گالی الاونس" اور "موچی دروازے کا مارکو پولو" وغیرہ۔ تارڑ گھریلو حالات اور خاص طور پر بیوی کی چھیڑ چھاڑ سے بھی خوبصورت مزاح پیدا کرتے ہیں۔اُن کے کالموں کی کتاب "اُلو ہمارے بھائی ہیں" میں اس کی مثالیں موجود ہیں"۔[40]

اُن کے کالموں کو کتابی شکل میں سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔اس کے علاوہ اُن کے مشہور کالم میں چک چُک، گزرا نہیں ہوتا،ہزاروں ہیں شکوے، شتر مرغ ریاست، کارواں سرائے،بے عزتی خراب، تارڑ نامہ شامل ہے۔

(ز) مثنوی منطق الطیر اور ناول منطق الطیر جدید میں مماثلتیں

خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر اور مستنصر حسین تارڑ کے ناول منطق الطیر جدید میں کچھ حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔

مماثلت

۱۔ خواجہ فرید الدین عطارؒ کی مثنوی منطق الطیر اور مستنصر حسین تارڑ کے ناول منطق الطیر دونوں تخلیقات بلحاظ عنوان مشترک ہیں۔ صرف ناول منطق الطیر کے ساتھ جدید لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۲۔ دونوں فن پاروں میں تصوف و عرفان کو منفرد اور الگ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اس طرح موضوع کے اعتبار سے دونوں تخلیقات ایک جیسی ہیں۔

۳۔ صوفی ازم اور صوفیانہ عناصر کو دونوں فن پاروں میں نمایاں طور پر واضح کیا گیا ہے۔

۴۔ مثنوی منطق الطیر اور ناول منطق الطیر جدید دونوں تخلیقات میں پرندوں کو بطور علامت پیش کیا گیا ہے۔اس بناء پر دونوں مشترک ہیں۔

۵۔ناول منطق الطیر جدید حقیقت میں خواجہ فرید الدین عطارؒ کی مثنوی منطق الطیر کا تسلسل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے یہ ناول فرید الدین عطار کی شاہکار تحریر سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

٦۔ ناول میں سات پرندوں کا ذکر ہے جن کا تعلق مختلف مذاہب سے ہے جبکہ مثنوی میں عشق کی سات

وادیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۷۔ دونوں فن پاروں میں پرندے اپنے ایک مخصوص مقام کی طرف سفر کرتے ہیں۔ مثنوی منطق الطیر میں پرندے کوہ قاف پہاڑ کی طرف اُڑان بھرتے ہیں جب کہ ناول میں بھی پرندے جہلم کے قریب ٹلہ جوگیاں پہاڑ کی طرف رخت سفر باندھتے ہیں۔

۸۔ ان دونوں تخلیقات میں پرندے جب سفر کرتے ہیں تو وہ مشکل اور کھٹن گزار راستوں سے سفر کر کے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں۔

۹۔ دونوں فن پاروں میں پرندوں کا سفر سچائی کی حقیقت کو تلاش کرنے کی غرض سے ہوتا ہے۔

10۔ خواجہ فرید الدین عطارؒ کی مثنوی منطق الطیر میں اسلامی تصوف کی بات ہوئی ہے اسی طرح ناول منطق الطیر جدید میں بھی جہاں باقی مذاہب میں تصوف کا ذکر ہوا ہے وہاں پر مذہب اسلام کا بھی خصوصی ذکر ہوا ہے۔ دونوں نے اسلام کے تصوف و عرفان کی بات کی ہے۔

11۔ دونوں تخلیقات کے مصنف ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ دونوں کی شہرت عام ہے۔ دونوں شخصیات بین الاقوامی سطح پر بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ خواجہ فرید الدین اور مستنصر حسین تارڑ دونوں کئی کتب کے مصنف ہیں۔ دونوں شخصیات کا ادب کی دُنیا میں ایک نمایاں مقام ہے۔

12۔ ناول منطق الطیر جدید میں عطارؒ کی مثنوی کا تذکرہ ملتا ہے۔ عطارؒ کے پرندے جو عشق کی سات وادیوں سے گزرتے ہیں۔ اُن میں ہدہد جو پیر مغاں تھا باقی سب پرندوں کا مرشد اور رہنما تھا۔ کوہ طور کی پر جلی فاختہ۔ طوطا، بلبل، مرغابی اور عقاب کون تھے ان سب کا ناول میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کا ناول اور عطارؒ کی مثنوی دونوں مشترکہ خیالات کی عکاسی کر رہے ہیں اور یہ ناول بھی اُس مثنوی کا ایک قسم کا تسلسل ہے۔

اختلافات

مثنوی منطق الطیر اور ناول منطق الطیر جدید دونوں فن پاروں میں جہاں کچھ باتیں مشترک ہیں تو وہاں کئی باتوں پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ ذیل میں اُن کا مختصراً جائزہ لیا جاتا ہے۔

1۔ دونوں تخلیقات میں اہم فرق اصناف کا ہے۔ دونوں فن پارے الگ الگ صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواجہ فرید الدین عطارؒ کی کتاب "منطق الطیر" بلحاظ صنف ایک مثنوی ہے جس میں اشعار کی تعداد ۴ ہزار چھ سو ہے۔ جب کہ مستنصر حسین تارڑ کی کتاب "منطق الطیر جدید" بلحاظ صنف ناول ہے۔

2۔ فرید الدین عطار خود عملی طور پر تصوف کے راستے پر چلے ہیں وہ ایک نامور صوفی شاعر کا درجہ رکھتے ہیں وہ اہل سلوک، عارف باللہ، اور عالم دین کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا مقام الگ درجے کا ہے۔ وہ خود فرید الدین عطار کو اپنا مرشد مانتے ہیں جس کا اعتراف اُنہوں نے اپنے ناول کے انتساب میں کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نہ ہی صوفی ہیں اور نہ سالک۔

3۔ مثنوی منطق الطیر میں مذہب اسلام کے تصوف کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس میں پرندے عشق کی سات وادیوں کا سفر کرتے ہیں۔ جب کہ ناول منطق الطیر جدید میں تمام مذاہب میں موجود تصوف کو متعارف کرایا گیا ہے۔ جیسا کہ بدھ مت میں تصوف، عیسائیت اور اسلام میں تصوف وغیرہ۔

4۔ مثنوی منطق الطیر میں صوفی کو صرف ایک مذہب اسلام کے نقطہ نگاہ سے دیکھا گیا ہے جبکہ ناول منطق الطیر جدید میں مستنصر حسین تارڑ صوفی کو وسیع النظر انداز سے دیکھتے ہیں۔

5۔ مثنوی "منطق الطیر" میں پرندے کوہ قاف پہاڑ کی طرف اُڑان بھرنے سے پہلے مختلف انواع کے عذر پیش کرتے ہیں۔ وہ اس سفر پر نہ جانے کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے ہیں لیکن ناول "منطق الطیر جدید" میں ایسا کچھ پڑھنے کو نہیں ملتا۔

6۔ مثنوی " منطق الطیر" میں پرندوں کو بطور علامت پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے ہدہد، طوطی، چکور، بلبل، تیتر، مور، شکرہ، لیکن ناول " منطق الطیر جدید" میں سات پرندوں کا ذکر تو ہے لیکن اُن کے نام پرندوں کے نام سے ملتے جلتے نہیں۔ اُن پرندوں کے نام اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ غار حرا کا پرندہ، کوہ طور کا پرندہ، مریمؑ کا پرندہ وغیرہ۔ پرندوں کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

7۔ ایک اہم فرق زبان کا بھی ہے دونوں مصنف اپنی اپنی زبان کے ادب سے وابستہ ہیں۔ فرید الدین عطار فارسی زبان و ادب سے تعلق رکھتے ہیں تو دوسری طرف مستنصر حسین تارڑ کا تعلق اُردو زبان و ادب سے ہے۔ مثنوی منطق الطیر فارسی زبان میں ہے اور ناول منطق الطیر جدید اُردو زبان کا ایک نیا شاہکار ہے۔

8۔ مثنوی منطق الطیر میں صوفیانہ عناصر کو آسان اور عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے لیکن ناول منطق الطیر جدید ایک مشکل ناول ہے جو کہ ہر ایک کو آسانی سے سمجھ نہیں آتا۔ اس کی سمجھ کے لئے عام قاری کو کافی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس ناول کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو تاریخ، مذہبی روایات اور اساطیر سے واقف ہو۔

9۔ فرید الدین عطار تصوف کے شاعر ہیں جبکہ مستنصر حسین تارڑ ایک ناول نگار، سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، اور

ڈرامہ نگار ہیں۔

۱۰۔ مثنوی منطق الطیر میں ہدہد پرندہ تمام پرندوں کا رہنما ہوتا ہے۔ باقی پرندے ہدہد کو اپنا رہنما سمجھ کر عشق کی منازل طے کرتے ہیں اور کوہ قاف کی کٹھن پہاڑی کا سفر ہدہد کی رہنمائی سے سر ہوتا ہے۔ ناول منطق الطیر جدید میں پرندے ٹلہ جوگیاں کی طرف مختلف علاقوں اور خطوں سے سفر کرتے ہیں لیکن ان میں کوئی بھی پرندہ رہنما نہیں ہوتا کہ جس کی قیادت میں پرندے سفر اختیار کرتے ہوں۔ کونسا پرندہ سربراہ ہے یہ واضح نہیں ہے۔

تبصرہ

تصوف سے مراد انسان کا ایک ایسا کردار ہے کہ جس میں اُس کی نفسانی خواہشات زیر ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ تصوف کو اپنا عملی شعار بناتے ہیں وہ اپنے تمام معاملات حقیقی طور پر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ صوفیاء کرام نے ہمیشہ سادگی کو اپنا شعار بنایا اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرکے راہ راست پر لانے کی ترغیب دی۔ صوفیاء کرام وہ محبوب لوگ ہوتے ہیں جو ہمیشہ انسانیت سے بلا تفریق شفقت اور ہمدردی فرماتے ہیں ۔اس میں ذات پات اور مذہب کی تفریق بھی رکاوٹ نہیں بنتی بلکہ خلوص نیت سے سب کے ساتھ برابری کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ تصوف وہ دل چسپ موضوع ہے کہ جس کے اثرات اُردو ناول پر ابتداء ہی سے چلے آرہے ہیں۔ اُردو کا پہلا ناول "مراۃ العروس" ہے اور پہلے ناول میں بھی تصوف کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ اُردو ناول پر تصوف کی گہری چھاپ ہے چاہے وہ عمیرہ احمد کا ناول "پیر کامل" ہو، بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ" ہو یا مستنصر حسین تارڑ کا ناول "ڈاکیا اور جولاہا" ہو متصوفانہ رنگ نظر آئے گا۔ تصوف کی راہ کو اپنانے والے کئی صوفیاء کرام نے اپنا مثالی کردار ادا کیا اور مخلوقِ خُدا کو اپنا گرویدہ بنایا۔ شیخ فرید الدین عطارؒ جن کا تصوف کی دُنیا میں ایک بلند مقام ہے۔ اولیاء کرام سے محبت آپ کو وراثت میں ملی کیونکہ آپ کے والدِ گرامی ابراہیم بن اسحاق خود اولیاء کاملین سے عقیدت اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ یہی محبت آگے اُن کی اولاد میں منتقل ہوئی۔ خواجہ فرید الدین عطارؒ نے راہِ حقیقت اور راہِ تصوف میں کئی ممالک کا سفر کیا جن میں کوفہ، مکہ مدینہ ہندوستان قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں چالیس (۴۰) کتابیں تحریر کی لیکن آپ کی دو کتابوں کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی جن میں "تذکرۃ الاولیاء" اور "منطق الطیر" زیادہ شہرت کی حامل ہیں۔ خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی "منطق الطیر" اور مستنصر حسین تارڑ کے ناول "منطق الطیر جدید" موضوعاتی لحاظ سے

ایک ہی درس لیے ہوئے ہے۔ دونوں کا موضوع تصوف ہے لیکن بہت سی چیزیں مشترک نہیں بھی ہے۔ اُن میں اختلافی عنصر پایا جاتا ہے لیکن یہ دونوں تصانیف ایسی ہے کہ قاری اِن کا مطالعہ کرتے ہوئے تصوف کی دُنیا میں گم ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ابوریحان البیرونی، کتاب الہند، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۲

۲۔ سید احمد دہلوی، مولوی مرتب فرہنگ آصفیہ، جلد اول، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۷ء، ص ۶۷

۳۔ غلام قادر لون، ڈاکٹر، مطالعہ تصوف، (قرآن وسنت کی روشنی میں) دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۳۲

4.William Stoddart, Sufism,suhail academy, Karachi, 1998 P.20

۵۔ خواجہ عبدالمجید، جامع اللغات، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء ص ۸۷

۶۔ محمد حسن، پروفیسر، دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر، (عہد میر تک) اُردو اکادمی، دہلی، طبع اول ۱۹۸۹، ص ۲۹

۷۔ علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب، مترجم، ڈاکٹر فصل الدین گوہر، ناشر ضیاالقران پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۰ء ص ۲۱۲

8.Julain Baldick, Mystical Islam.an introduction to Sufism,Tauris parke paperbacks, London,2000,P 3.

۹۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۶ دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۱، ص ۴۱۸

۱۰۔ ابونصر سراج، کتاب اللمع، بحوالہ محمد شریف بقا، اقبال اور تصوف، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱، ص ۲۶۔

۱۱۔ شیخ عبدالقادر جیلانی، غنیتہ الطالبین، مترجم، شمس صدیقی، پروگریسو بکس، لاہور، س۔ن، ص ۶۵۱

۱۲۔ محمد طاہر القادری، پروفیسر، ڈاکٹر، حقیقتِ تصوف، منہاج القران پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰، ص ۱۳۷

۱۳۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر، تاریخ مشائخ چشت، ادارہ ادبیات، دہلی، ۱۹۸۰ء ص ۳۳

14- A.J Arberry,The doctorine of the sufis, publisher, SH, Muhammad Ashraf,Lahore,۱۹۶۶,P ۶.

۱۵۔ بشیر احمد صدیقی، نذیر احمد کی ناول نگاری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۲۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۱۸۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مضمون، مولوی نذیر احمد، مشمولہ، تاریخ ادبیات، مسلمانان پاکستان جلد ۹، ۱۹۷۶ء ص ۳۹۳

۱۹۔ عمیرہ احمد، پیر کامل، فیروز سنز (پرائیوٹ لمیٹڈ)، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳۱
۲۰۔ ایضاً، ص ۳۶۹
۲۱۔ انتظار حسین، بستی، نقش اوّل کتاب گھر، لاہور، ۱۹۶۸، ص ۱۵۷
۲۲۔ فضل کریم فضلی، خون جگر ہونے تک، دبستان، کراچی، ۱۹۶۰ء، ۱۶۴
۲۳۔ ایضاً، ص ۲۳۲،
۲۴۔ محمد یحییٰ خان، موم کی مریم، پرائم پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸
۲۵۔ بانو قدسیہ راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴
۲۷۔ ایضاً، ص ۲۹۲
۲۸۔ ایضاً، ص ۳۸۳
۲۹۔ مستنصر حسین تارڑ، ڈاکیا اور جولاہا" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۲
۳۰۔ حکیم مطیع الرحمٰن نقشبندی، مترجم، حکایات فرید الدین عطارؒ، منطق الطیر، ضیا القرآن پبلی کیشنز، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۱
۳۱۔ ایضاً ۲۳
۳۲۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ، تذکرۃ الاولیاء، ضیاالقرآن پبلی کیشنز، لاہور، مئی ۱۹۹۷ء، ص ۵
۳۳۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۴
۳۴۔ ایضاً ص ۱۴
۳۵۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۷
۳۶۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ فن اور شخصیت، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۵
۳۷۔ ایضاً ص ۲۰
۳۸۔ فرزانہ سید، نقوش ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء ص ۴۹۸
۳۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، س ن، ص ۵۲
۴۰۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اُردو نثر میں طنز و مزاح، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۵۴۳

باب دوم

منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر۔ غیر الہامی مذاہب کے حوالے سے

الف: بدھ مت مذہب کے حوالے سے

بدھ مت

بدھ مت ایسا مذہب ہے جو مختلف قسم کے عقائد و نظریات، روایات، اور طرز عمل پر مبنی ہے۔اس مذہب کی زیادہ تعلیمات گوتم سدھارتھ کے ساتھ منسوب ہیں۔بدھ مت مذہب کا شمار دُنیا کے بڑے مذاہب میں ہوتا ہے۔اس مذہب کی بنیاد آج سے تقریباًڈھائی ہزار سال قبل جنوب ایشیاء میں شمالی بہار اور نیپال سرحد کی ایک ریاست "کپل وستو" کے ایک شہزادے نے رکھی۔بدھ مت کے بانی کا نام مہاتما بدھ تھا جبکہ اصل نام "سدھارتھ" تھا۔لقب کے طور پر" گوتم " کہا جاتا ہے۔"مہاتما" لفظ تعظیماً اور احترام کے طور پر بولا جاتا ہے۔

بدھ مت دُنیا کا چوتھا بڑا مذہب شمار کیا جاتا ہے اور یہ مذہب پورے ایشیاء میں پھیلا۔اس طرح یہ مذہب ایک "مشرقی " مذہب ہے لیکن یہ مذہب اب مغربی دُنیا میں بھی پھیلتا جا رہا ہے۔بدھ مت کی اشاعت،ترقی،اور نشوونما جن ممالک میں زیادہ ہوئی اُن ممالک کی فہرست میں چین ، نیپال، تبت، ملایشیا، انڈونشیا، کوریا، اور جاپان شامل ہیں۔ان تمام ممالک میں بدھ مت مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت ہے۔دیگر ممالک میں بھی بدھ مت مذہب کے لوگ آباد ہیں اور اس طرح یہ ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ابتداء میں یہ مذہب دو گروہوں میں تقسیم ہوا۔ایک گروہ کے لوگ مذہبی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے اور پھر ان تعلیمات کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دنیاوی کام، کاروبار، اور دیگر معاملات بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔یہ لوگ "اپاسک" کہلاتے تھے۔دوسرا گروہ ایسا تھا جو دُنیا کی عام زندگی سے مکمل آزاد تھا۔یہ گروہ ہمہ وقت اپنی ریاضت وعبادت میں مصروف عمل رہنا چاہتا تھا۔اس گروہ کے افراد " بھکشو" کہلائے۔گوتم بدھ نے بھی ان دو قسم کے گروہوں کے لئے اپنے دروازے نہ صرف کُھلے رکھے بلکہ اِن لوگوں تک اپنا پیغام اور تعلیمات پہنچائی۔گوتم بدھ نے اپنے مذہب کی تبلیغ میں تقریباً ۴۵ سال کا عرصہ گزارا اور اس طرح اپنے مذہب کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچایا۔مذہب کی تبلیغ کا کام گوتم بدھ کی وفات کے بعد

"بھکشوں" (صوفیاء) کے سپرد کر دیا گیا۔ جو کہ عبادت و ریاضت میں رہنے والے لوگ تھے۔ اس گروہ نے ابتداء میں ایک اجتماع کروایا اس اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ گوتم بدھ کی تعلیمات کو منظم طریقے سے ترتیب دیا جاسکے تاکہ مستقبل میں اس مذہب کو مستحکم کیا جاسکے۔ اس اجتماع میں پانچ سو بھکشوں نے شرکت کی اور تمام بدھ مگدھ کی راجدھانی راج گڑھ میں مہاکشپا کی زیر نگرانی اکھٹے ہوئے۔ ان بھکشوں (صوفیاء) کے اجتماع کی بدولت گوتم بدھ کی تعلیمات کو مدون کیا گیا اور اس سلسلے میں مذہب کے قوانین اور عقائد کو منظم انداز میں مرتب کیا گیا۔ اس اجتماع کے بعد مستقبل میں بدھ مت مضبوط اور محفوظ ہو گیا۔ بدھ مت مذہب کو اپنے ابتدائی دور میں ہی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی یہاں تک کے برہمنی مت سے بدھ مت مذہب کہیں زیادہ ترقی کر گیا۔ جس کو عماد الدین نے یوں بیان کیا ہے۔

> "ایک طبقے میں روایت پرستی کڑپن اور شرعی قوانین کی لفظی پابندی پر زور تھا لیکن ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو گوتم بدھ کے نافذ کیے ہوئے ان مذہبی قوانین کی روح کو زیادہ اہمیت دیتا تھا اور حالات کے تقاضے کے تحت بعض قوانین میں جزوی ترمیم و تبدیلی میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ دوسرا طبقہ "اجتہاد" کا قائل تھا"[1]

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بدھ مت مذہب کو ایسے حکمران ملے کہ جن کی وجہ سے اس مذہب کو خوب پذیرائی ملی اور یہ مذہب عام لوگوں میں مقبول ہو گیا۔ ان شخصیات میں راجہ اشوک جیسا حکمران بھی شامل تھا۔ راجہ اشوک جس کا تعلق "موریہ" خاندان سے تھا۔ یہ تیسرا بادشاہ تھا۔ راجہ اشوک نے اپنی خاندانی روایات کو جاری و ساری رکھا۔ مذہب کا سہارا لیتے ہوئے اپنی حکومت کو مضبوط بنایا اور پھر آہستہ آہستہ بدھ مت اور راجہ اشوک دونوں ایک دوسرے کے لئے بہت اہم ہو گئے۔

> "اشوک کی زیر سرپرستی اس مذہب کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ اس مذہب پر پابندیاں تھیں وہ اُٹھائی گیئں۔ خانقائیں وجود میں آئیں شاہی تقریبات میں بھکشوں کو پذیرائی ملی، مقدس مقامات پر نئی عمارتیں وجود میں آگئیں اور نئے کتبات نصب کرائے گئے۔[2]

سری لنکا میں اشاعت مذہب کے لئے راجہ اشوک نے اپنے بیٹے کو یہ ذمہ داری سونپی جس کے نتیجے میں بدھ مت مذہب کو عروج حاصل ہوا۔ آج کے دور میں بھی بدھ مت مذہب سری

لنکا، برما، چین، ویتنام، تھائی لینڈ، کمبوڈیا، جیسے ممالک میں اُسی طرح مقبول ہے جتنا کہ آج سے سینکڑوں سال پہلے تھا۔ آثار قدیمہ کی دریافت سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ عیسوی سن کی ابتدائی صدیوں میں بدھ مت کو عروج حاصل ہوا اور یہ آثار وسط ایشیاء، کابل، قندھار، چین، وغیرہ میں ظاہر ہوئے۔

بُدھ مت مذہب کے بنیادی عناصر

بُدھ مت مذہب دُنیا کے معروف مذاہب میں سے ایک ہے۔ بُدھ مت مذہب بڑے پیمانے پر ایک مشرقی مذہب ہے لیکن اپنی مقبولیت کی بناء پر مغربی دُنیا میں تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ یہ ہندو مت سے ملتا جلتا مذہب ہے اور یہ دونوں مذاہب "کرما" (اعمال اور اُن کے انجام کی اخلاقیات) "مایا" دُنیا کی پُر فریب فطرت اور "سمسارا" (جنموں کے چکر) کی مشترکہ تعلیم دیتے ہیں۔ بدھ مت مذہب کے ماننے والوں کا یہ ایمان ہے کہ زندگی کا حتمی مقصد "روشن خیالی" ہے۔ گوتم بُدھ نے یہ دریافت کیا کہ روشن خیالی نہ تو عیش و عشرت کی زندگی میں ہے اور نہ ہی نفس کشی میں بلکہ یہ " میانہ وری " میں پائی جاتی ہے مزید گوتم نے ایسے تصورات دریافت کیے تھے جو کہ چار عظیم سچائیوں پر مشتمل تھے۔

1۔ زندہ رہنا دُکھ اُٹھانا ہے (دُکھا)

2۔ تکلیف کا سبب خواہش ہے

3۔ کوئی بھی انسان اپنی تمام وابستگیوں کو ترک کر کے تکالیف سے نجات پا سکتا ہے

4۔ تکلیف سے نجات پانے کے "آٹھ رُخی" کی پیروی ضروری ہے۔

آٹھ رُخی راستہ مندرجہ ذیل باتوں پر مشتمل ہے۔

1۔ نظریہ

2۔ ارادہ

3۔ گفتگو

4۔ عمل

5۔ روزگار (بحثیت ایک درویش)

6۔ جدوجہد (توانائیوں کا مناسب انداز میں استعمال)

7۔ فکر (دھیان گیان)

8۔ارتکاز (توجہ مرکوز کرنا)

بدھ مت دیوتاؤں اور اعلیٰ ہستیوں کے بارے میں مفصل الہیاتی علم بھی پیش کرتا ہے۔بدھ مت مذہب کے بعض فرقے "دہریے" بعض کو" مظاہر پرست "جبکہ بعض کو "توحید پرست" کہا جاسکتا ہے لیکن بُدھ مت میں ایک حتمی الٰہی ذات کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔بُدھا نے کبھی بھی خود کو خُدا یا اور کسی قسم کی الٰہی ہستی خیال نہیں کیا تھا۔اُس نے ہمیشہ اپنے آپ کو دوسروں کو "راہ دکھانے والا" سمجھا تھا۔یہ صرف بُدھا کی موت کے بعد ایسا ہو تھا کہ اُس کے بعض پیرکاروں نے اُسے دیوتا کے مقام پر فائز کر دیا تھا لیکن اُس کے تمام ماننے والے اُس کو ایسے نہیں مانتے۔بُدھ مت میں گناہ کو "اخلاقی غلطی" سمجھا جاتا ہے چونکہ انسان کی فطرت میں اخلاقیات کا دخل نہیں ہوتا اِس لیے "کرما" (اعمال اور اُس کے نتائج) ضابطہ اخلاق نہیں ہے لہذا بنیادی طور پر گناہ غیر اخلاقی نہیں ہے۔اُس کی وجہ یہ ہے کہ بُدھ مت میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ گناہ ایک غیر ذاتی اور قابلِ حل غلطی ہے اِس وجہ سے بُدھ مت انسانی ذات میں مکمل بگاڑ کے عقیدے سے ہی اتفاق نہیں کرتا جو کہ عیسائیت کا ایک بنیادی عقیدہ ہے اسی طرح جب بُدھا سے یہ سوال کیا جاتا کہ اِس دُنیا کو بنانے والا کون ہے؟تو ایسی صورت حال میں خاموشی اختیار کی جاتی کیونکہ بُدھ مت میں نہ آغاز ہے نہ اختتام۔ایسے ہی بُدھ مت میں انسان کی پیدائش اور موت کا کبھی نہ ختم ہونے والا چکر پایا جاتا ہے۔

گوتم بدھ

گوتم بدھ کی پیدائش ۵۶۳ ق م میں ہوئی۔گوتم کی پیدائش شمالی ہند کے علاقہ نیپال میں ہوئی۔گوتم بدھ کے والد کا نام شدھودھن تھا جبکہ والدہ کا نام مہامایا تھا۔گوتم کی پیدائش کے بارے میں مختلف نجومیوں نے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ ایسا بچّہ پیدا ہو گا جو کہ کرہ ارض پر حکومت کرے گا۔گوتم کے مزاج اور طبعیت میں شروع ہی سے تنہائی کا رجحان تھا۔بچپن میں گوتم کا نام سدھارتھ رکھا گیا یہ گوتم کا خاندانی نام تھا۔گوتم بدھ کی تعلیم و تربیت شاہی خاندان کے طریقہ کار کے مطابق ہوئی۔گوتم جب اُنیس برس کے تھے کہ ایک دن اپنے ذاتی خادم کو ساتھ لے کر نکلے۔راستے میں ایک ایسے بزرگ کو دیکھا جو کہ مفلوک الحال اور فرسودہ دل انسان تھا۔بڑھاپے کی وجہ سے اُس کا چلنا بہت مشکل اور گراں تھا۔اُس کے بعد ایک اور ضعیف کمزور اور لاچار بیمار پر نظر پڑی جو کہ ایک قدم بھی بڑی مشکل سے چل سکتا تھا۔اُس شخص کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور اُس کی ٹانگیں اس قدر کمزور اور لاغر تھی کہ اُس کے جسم کا بوجھ اُٹھانے سے وہ قاصر تھیں۔مزید آگے چل کر گوتم

نے ایسے لوگوں کو دیکھا کہ جو ایک جنازے کو کندھا دیئے قبرستان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان تین واقعات کے بعد گوتم کو راستے میں ایسا فقیر ملا جس کا باطن صاف اور چہرہ نورانی تھا اور جس میں قناعت بہت زیادہ تھی۔ گوتم بدھ نے انسانی زندگی کے تین خطرناک پہلوؤں کا مشاہدہ کیا تو دُنیا کی محبت سے دل اُٹھ گیا۔ گوتم کو ایک ہی خیال بار بار آرہا تھا کہ ایک دن وہ بھی بیماری اور موت کی کشمکش میں ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس بزرگ کا بھی خیال آیا کہ جو سکون کی دولت سے مالا مال تھا اور وہ فقیرانہ راہ پر یاد الٰہی میں مشغول تھا۔ گوتم کو یہ سوچ آئی کہ وہ بھی کیوں نہ اُس درویش کی طرح دُنیا کی رنگینی سے منہ موڑ کر ایسی زندگی کا آغاز کرے کہ جس سے انسان کو قلبی سکون میسر آسکے اور انسان ہر دم اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہے۔ گوتم بدھ کا دل ابتداء سے تنہائی کی طرف راغب تھا۔ ایسے حالات وواقعات نے گوتم بدھ کے دل اور دماغ پر گہرا اثر کیا اور ایک دن سدھارتھ نے اپنے گھر کو خیر آباد کہنے اور زہدانہ زندگی کا آغاز کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ گوتم بدھ نے درویشانہ زندگی کا آغاز کیا۔ درویشوں کے ساتھ محبت اختیار کی۔ اپنے نفس کو ختم کرنے کے لئے ریاضتوں اور چلّوں کا آغاز کیا اور اس قدر ذوق شوق سے ریاضتیں کی کہ جسم بالکل سوکھ کر کمزور ہوگیا۔

> "اُنہوں نے جوگ کی ریاضتوں کی آزمائش کا قصد کیا اور ازدیل کے جنگل میں جو آجکل بُدھ گیا کے نام سے مشہور ہے۔ چھے سال تک دردناک ریاضتیں اور سخت مشقتیں اُٹھائیں۔ نفس کشی کرتے کرتے جسم تحلیل ہو کر کانٹا ہوگیا"۔[۳]

گوتم بُدھ نے ازدیل کے جنگل میں مختلف چلے کاٹے اور اِسی جنگل میں تین بھائی اور بھی تھے جو کہ فقیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ تمام لوگ اِن تینوں بھائیوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان تین بھائیوں میں سے ایک بھائی کا گوتم بُدھ کے ساتھ ملنے ملانے کا اتفاق ہُوا تو وہ گوتم بُدھ کا گرویدہ ہوگیا۔ اس طرح اُس کے اپنے بہت سے پیروکار گوتم بُدھ کی غلامی میں آگئے۔ گوتم بُدھ نے تقریباً اکیس برس تک اپنے مذہب کی تبلیغ کی۔ اُنہوں نے اس قدر سخت ریاضتیں کیں کہ جسم سوکھ کر ہڈیوں کا پنجرہ بن گیا تھا اور وہ قریب المرگ ہوگئے تھے ایسی صورت حال کو پہنچ کر اُن کو یہ خیال آیا کہ یہ جسمانی ریاضت والا طریقہ بھی اُن کے مسائل کو حل نہیں کر رہا ہے اور یہ سودمند ثابت نہیں ہو رہا۔ اُن کو یہ محسوس ہوا کہ وہ " ابدی مسرت " کے حصول میں ناکام رہے گے چنانچہ اُنہوں نے اس راستے کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔

> " گوتم سدھارتھ نے ایک چرواہن کی نذر کی ہوئی کھیر قبول کر کے اپنا برت توڑ دیا اور گویا اس طرح گوتم سدھارتھ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ نجات کا راستہ جسم کو گلا

دینے والی شدید جسمانی ریاضت سے نہیں بلکہ ایک معتدل زندگی کے ذریعہ ہی
مل سکتا ہے"۔[۴]

گوتم بُدھ نے جب اپنا برت توڑا اور ایک معتدل زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تو گھاس کا آسن بنا کر ایک پیپل کے درخت کے نیچے مخصوص مراقبے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اپنے آپ سے یہ عہد کیا کہ وہ اُس وقت تک اس جگہ کو نہیں چھوڑیں گا جب تک وہ "ابدی مسرت" کے بھید کو پا نہیں لیتا۔ اس عہد کے بعد گوتم سدھارتھ اپنے مراقبہ میں غرق ہو گیا۔

بدھ مت کی مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے رات کے پہلے پہر ہی اُس علم کو پا لیا جو کہ ہندوستان کی تاریخ میں اعلیٰ روحانیت کا درجہ سمجھا جاتا ہے۔ آدھی رات کو اُن پر دُنیا کی چار عظیم حقیقتوں کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ ان حقیقتوں میں بُدھ مت کا بنیادی فلسفہ مضمر ہے۔ رات کے آخر پہر میں گوتم سدھارتھ اپنے مراقبے کے ذریعے نروان (نجات) کو حاصل کر لیا اور اس طرح مقاصد کو پہنچ کر وہ گوتم سدھارتھ سے گوتم بدھ بن گئے۔ اُن کے ہر مسئلے کا حل مل گیا اور وہ "ابدی مسرت" حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بُدھ مت کی تعلیمات

گوتم بُدھ کا زمانہ ایسا زمانہ تھا کہ جس زمانے میں عام پڑھنے لکھنے کا رواج نہ تھا۔ ایک لمبے عرصے تک اُن کی تعلیمات عام لوگوں تک زبانی طریقے سے منتقل ہوتی رہی۔ اُن کی تعلیمات کو تحریری شکل میں مرتب کرنے کے لئے تین سو سال کے بعد اشوک کے زمانے میں کوشش کی گئی۔ یہ کتابیں جو تحریری شکل میں لکھی گئی اُن کو "تری ٹپک" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اِن کتب کو عام بہاری زبان (پالی) میں لکھا گیا ہے جو کہ اُس زمانے میں رائج تھی۔ اِن کتابوں کی اصل جلدیں جو اشوک کے زمانے میں تحریر کی گئیں اُن کی دستیابی ناپید ہو گئی۔ بدھ مت کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب ایک فلسفے کی حیثیت سے اپنی تعلیمات کے زور سے اعمال و اخلاق پر پیش کیا گیا۔

بُدھ مت کا فلسفہ

بُدھ مت کے پیروکار اس دُنیا کے علاوہ بہت سی اور دُنیاوں کے بارے میں اپنی رائے رکھتے تھے لیکن وہ کسی اور عالم یا جہان کے قائل نہیں تھے۔ بُدھ مت کا سارا فلسفہ اس زندگی کا قائل تھا اور اس زندگی کے اخلاقی نتائج کا قائل تھا۔ بُدھ مت مذہب کے ماننے والے روح کی حقیقت سے ناواقف تھے وہ انسانی روح کو سرے سے تسلیم

ہی نہ کرتے تھے اور نہ ہی اسے انسانی جسم سے کوئی الگ چیز ماننے کے قائل تھے۔

"وہ اس امر پر بہت زور دیتے تھے کہ عالم میں جتنی چیزیں ہیں وہ اسباب و علل کے ماتحت آئی ہیں اور ہر چیز ہر لمحہ ایک غیر محسوس اور نامعلوم طریقے پر بدلتی رہتی ہے یعنی ہر شے قانون تغیر و تبدل اور علیّت کے تابع ہو"۔(۵)

اس مذہب کے پیروکار نہ ہی جنت کے تصّور کو مانتے اور نہ ہی جہنم کی حقیقت سے واقف تھے۔ان دونوں کو وہ تسلیم کرتے تھے لیکن اس بات کے قائل نہیں تھے کہ یہ جنت اور جہنم حقیقت میں ہے۔ گوتم بُدھ نے نہ کبھی کائنات کی تخلیق کے بارے میں بات کی اور نہ کبھی خُدا کے وجود کے بارے میں کُھل کر بات کی،خُدا کی حقیقت پر کبھی اظہار رائے نہیں کیا اور اس کے علاوہ حشر و نشر،روز قیامت، جیسے مسائل پر کبھی کوئی موقف اختیار نہیں کیا۔اِن تمام حقیقتوں کو اُنہوں نے پس پشت ڈال کر صرف اخلاقی احکامات کی تلقین کی اور گوتم نے اپنی تعلیمات میں حقوق العباد،بیوی کے حقوق،اُستاد اور شاگرد کے حقوق پر زیادہ زور دیا ہے۔

گوتم بُدھ کے مطابق زندگی میں انسان کو کئی دُکھ ملتے ہیں اس لئے زندگی کی اصل دُکھ ہے۔اس دُکھ کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔انسان کی بیماری،ذہنی پریشانی،عزیز واقارب سے دوری ہوسکتی ہے۔ گوتم کی سوچ میں زندگی کی عارضی خوشیاں بھی دُکھ کا سبب بنتی ہے کیونکہ انسان کی خوشی رخصت ہوتی ہے تو پیچھے دُکھ چھوڑ جاتی ہے۔ گوتم کے خیال میں دُکھ کی کہیں نہ کہیں کوئی بنیاد اور علت ہوتی ہے اور اس کے مطابق انسانی دُکھ کا سبب ہی انسانی خواہشات اور تمنائیں ہیں۔یہ خواہشات ہی انسان کو اس دُنیا میں دوبارہ جنم لینے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ گوتم بُدھ دُکھ کی حقیقت کو دُنیا کی اصل حقیقت قرار دیتا ہے۔دُکھ کی وجہ ہی انسانی خواہشات ہیں اس لئے انسان اِن خواہشات پر قابو پاسکتا ہے۔

بُدھ مت اور تصوف

بُدھ مت کے اثرات چین میں پہلی صدی عیسوی میں رائج ہونا شروع ہوگئے تھے۔بُدھ ازم متصوفانہ روایات کے اہم ترین ستون میں ین یانگ کا فلسفہ، کنیفو شس ازم،اور تاؤمت شامل ہیں جن پر بُدھ تصوف کی جدید عمارت استوار کی گئی ہے۔سدھارتھ تاہم روح کے قائل نہیں تھے لیکن چینی بُدھ تصوف میں خُدا کا تصور تاؤمت کی وجہ سے کافی مضبوط ہوا۔بدھ مت باقاعدہ طور پر متصوفانہ نظریے میں دوسری صدی عیسوی کے زمانہ میں ڈھل چکا تھا۔بدھ ازم تصوف میں مہاتما بُدھ کی "گیا" کے جنگل میں تپسیا اور نروان (نجات) کو پانے کے لئے " ترک دُنیا" کے خیالات نے خانقاہی نظام کو اور زیادہ وسعت دی اور اُس کے نتائج یہ نکلے کہ پورے

چین کے جنگلوں اور ویرانوں میں تارک الدنیا بھکشوؤں کی خانقائیں پھیل گئیں جو کہ نروان کی منزل تک رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے نے اس قدر زور پکڑا کہ مردوں اور عورتوں کی علیحدہ علیحدہ خانقائیں وجود میں آئیں۔ بُدھ ازم کے تصوف کی فکر کو کچھ یُوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

"اَنحطاط اور موت کا سبب پیدائش ہے مصیبت ہمارے کرموں کا ہی نتیجہ ہے جہالت اور علم کا وجود نہیں بس محسوساتی حالتیں ہیں۔ ہر چیز کیونکہ "لاموجود" کی منزل پر پہنچے گی اس لئے اس سے دل لگانا بیکار محض ہے۔ تمام لوازماتِ زندگی کا ترک لازم کرنا ہے۔"(۶)

بدھ مت میں متصوفانہ فکر موجود ہے جو کہ تین عوامل کو زیادہ اہمّیت دیتی ہے۔

سل۔ نفس کو ضبط کرنا۔

سماھادی۔ تمام ذہنی و فکری افعال اور حواس کو ایک ہی مرکز پر مرتکز کر دینا۔

پِنّا۔ مصائب کی اصل کو دریافت کر لینی والی فراست۔

بدھ مت کا تصوف محض اس بات کی تلقین نہیں کرتا کہ انسان دُنیا کی آسائشوں سے الگ ہو جائے بلکہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ انسان دنیاوی زندگی کو مکمل طور پر خیر آباد کہہ کر ایک الگ دُنیا بسالے جو کہ متصوفانہ دُنیا ہے۔ بُدھ مت مذہب زندگی کے تمام لوازمات سے کنارہ کشی کا درس دیتا ہے۔ چناچہ یہ بات دیکھنے کو ملتی ہے کہ بُدھ تصوف عقیدے کے طور پر مراقبے، اعمال وافکار، عملی زندگی کا سبق دیتا ہے۔ یہی بات ہے کہ بُدھ صوفی جن کو بھکشو کہا جاتا ہے وہ فنائے کامل کے لئے مختلف قسم کی ریاضتیں کرتے ہیں۔

بھکشو پہلے اپنے کھانے پینے کی اشیاء پر غور کرتے ہیں اور اس بات کو لایعنی قرار دے کر اس سے بے زاری اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں صوفی (بھکشو) اپنے جسم کے اعضاء پر غور و فکر کرتا ہے۔ پھر ان اعضاء کی ناپائیداری پر غور و فکر کرتا ہے کہ یہ اعضاء تو ایک دن ختم ہو جانے ہیں۔ یہ جسم کے اجزاء تو فناء ہونے والے ہیں۔ وہ اپنے جسمانی اعضاء کو کم تر سمجھنا شروع کر دیتا ہیں۔۔ اُن کے ذہن میں جسمانی اعضاء کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ ایسی سوچ اور فکر سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ تیسرے مرحلے میں داخل ہو کر مہاتما بُدھ اور عظیم بھکشوؤں کے اقوال پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بھکشوؤں کے افعال اور مہاتما کے افعال پر خصوصی دھیان دیتے ہیں۔ بُدھ مت مذہب میں

ان تمام قسم کے مراحل کو "اپچار سمادھی" کہتے ہیں۔

ان تمام عوامل کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بُدھ مت مذہب میں تصوف انسان کو عملی زندگی سے فرار ہونے کا واضح انداز میں درس دیتا ہے۔ اپنی ذات کی بالکل نفی کرنا اور دُنیا کی عملی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے الگ تھلگ زندگی بسر کرنا اور اس سلسلے میں مختلف قسم کی ریاضتیں کرنا بُدھ مت متصوفانہ فکر کا اہم ترین پہلو ہے۔ تصوف کی زندگی میں مراقبہ اور دھیان بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

منطق الطیر جدید میں بُدھ مت صوفیانہ عناصر کا تذکرہ

"تصوف" بہت اہم اور دل چسپ موضوع ہے۔ کئی مصنفین نے "تصوف" کو اپنا موضوع بنایا اور اپنے مخصوص انداز میں اس کی وضاحت کی لیکن مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول "منطق الطیر جدید" میں صوفی ازم اور تصوف کو ایک الگ اور منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی نظر کسی ایک مذہب کے صوفی پر نہیں بلکہ وہ مختلف مذاہب میں پائے جانے والے صوفیانہ عناصر کو اپنے خاص نقطہ انداز میں دیکھتے ہیں۔ اُن کا یہ الگ اور مخصوص انداز اُن کے ناول منطق الطیر جدید میں خاص طور پر نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مستنصر حسین تارڑ کی پرندوں سے خاص اُنسیت ہے اور یہ لگاؤ آج کا نہیں بلکہ کافی پُرانا ہے۔ ناول منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر کو بیان کرنے کے لئے مصنف نے سات پرندوں کو علامت کے طور پر پیش کیا۔ ان سات پرندوں کا تعلق مختلف سامی و غیر سامی مذاہب سے جوڑا گیا ہے۔ ہر مذہب کا علامت کے طور پر ایک پرندہ ہے۔ حقیقت میں تو ویسے پرندوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، مذہب صرف جن وانس کے ہوتے ہے۔ بہر حال جہاں باقی مذاہب کے پرندوں کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا وہی مذہب بُدھ مت کے علامتی پرندے کا تذکرہ ملتا ہے۔ "تصوف" کا تعلق بُدھ مت مذہب سے بھی ہے اور خود بُدھ مت مذہب کے بانی گوتم بُدھ نے اس راستے کا انتخاب کیا تھا۔ اُنہوں نے اپنی خوش گوار زندگی کو ختم کر کے مشقت اور سخت ریاضت والی زندگی اپنائی تھی تا کہ وہ نروان کو حاصل کر سکے۔ مستنصر حسین تارڑ نے منطق الطیر جدید میں گوتم بُدھ کا ذکر کچھ یُوں کیا ہے۔

> " کپل وستو کے شہزادے گوتم کے گیان دھیان میں گُم فاقہ کش بدن کی پسلیوں کی ناتوانی کے اندر وہ پرندہ جو گھونسلا بنائے بیٹھا تھا۔ اُس کا بدن بھی لاغر ہو چکا تھا اُس نے بمشکل اپنے پر کھولے بُدھ کی پسلیوں کے گھونسلے میں سے پھڑ پھڑاتا، گرِتا پڑتا، بالآخر پرواز کے قابل ہو گیا دُنیا بھر میں جتنے بھی پرندے وجود

سے موجود میں آئے وہ سب اُڑانیں کرنے لگے"۔ (۷)

گوتم بُدھ کے من میں بھی دُنیا سے بے رغبتی تھی۔ اُس کا دل دُنیا سے اُٹھ چکا تھا پھر گوتم بُدھ کو بار بار اُس بزرگ فقیر کا خیال آتا تھا جو کہ ایک فقیرانہ زندگی بسر کر رہا تھا اور وہ سکون کی دولت سے مالا مال تھا۔ گوتم کے دل میں بھی یہ خیال آیا کہ وہ بھی اس فقیر کی طرح دُنیا کی رنگینی سے الگ ہو کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرے تا کہ وہ ہر دم عبادت میں مشغول رہے اور ذہنی و قلبی سکون اُس کو میسر آسکے۔ گوتم کا ذہن خلوت کی طرف مائل تھا۔ زندگی کے کچھ حالات و واقعات نے گوتم بُدھ کے دل اور دماغ پر گہرا اثر کیا اور اُس نے سب سہولیات کو ترک کر کے درویشانہ زندگی کا آغاز کیا۔ اس قدر سخت جسمانی ریاضتیں کیں کہ جسم بالکل لاغر اور سوکھ گیا۔ اس فاقہ کشی سے، مراقبے سے، اور ریاضت سے لوگ گوتم بُدھ کے بہت زیادہ گرویدہ ہو گئے اور آہستہ آہستہ اُن کے چاہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یُوں ایک نئے مذہب کی بنیاد پڑی اور آج بُدھ مت دُنیا کا چوتھا بڑا مذہب ہے۔ یہاں سے بُدھ مت بھکشوؤں (صوفیاء) کی ابتدا ہوئی۔ منطق الطیر جدید (ناول) میں بُدھ مت مذہب کے بانی اور صوفی گوتم بُدھ کا ذکر کیا گیا ہے۔ گوتم بُدھ سے ہی اس مذہب کی شروعات ہوئی اور متصوفانہ روایت کی ابتدا بھی گوتم سے ہی ہوئی۔ گوتم کی وفات کے بعد بھی بُدھ مذہب کا سلامت رکھنے میں ان بھکشوؤں (صوفیاء) کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔ یہی لوگ بُدھ مذہب کو آگے لے کر گئے۔ بُدھ مذہب میں راہب کو "بھکشو" کہا جاتا ہے جبکہ رائبہ کو "بھیکونی" کہا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کے بُدھ مذہب میں صوفیانہ عناصر پہلے دن سے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ ناول منطق الطیر جدید میں جب پرندے حقیقت اور سچائی کی تلاش میں ٹلہ جوگیاں کی طرف رخت سفر باندھتے ہیں تو اِن آبائی مسکنوں سے نکلنے والے پرندوں میں گوتم بُدھ کے فاقہ زدہ بدن سے نکلنے والا پرندہ بھی شامل تھا کہ جس کا دل بغاوت کی طرف مائل ہوا۔ باقی پرندوں کی مانند بُدھ مت پرندے نے بھی سچائی کی تلاش میں تصوف و عرفان کے راستے کا انتخاب کیا۔ مزید بُدھ مت کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ منطق الطیر جدید میں لکھتے ہیں۔

> "بُدھ کی پسلیوں میں جس نے ایک ایک تنکا جمع کر کے گھونسلا بنایا تھا اور جس کے پر جھلس چکے تھے۔ اُن کے سوا اور بھی پرندے تھے جو اپنے آبائی مسکنوں سے فرار ہو رہے تھے"۔ (۸)

بُدھ کی پسلیوں سے نکلنے والے پرندے نے ٹلہ جوگیاں کی طرف سفر کرنے کی ٹھان لی اور باقی پرندوں کا وہ ہم سفر بن گیا۔ بُدھ مت پرندے میں سچائی کو تلاش کرنے کی لگن موجود ہے تب ہی اُس کا باقی

پرندوں کے نکلنے کی خبر ہوتی ہے تو وہ بھی مائل پرواز ہو جاتا ہے۔بُدھ مت پرندے کی بغاوت کو مستنصر حسین تارڑ نے ناول منطق الطیر جدید میں یُوں بیان کیا ہے۔

> "بُدھ کے فاقہ زدہ بدن کی پسلیوں میں سے نکلنے والے پرندے کے بیر بہوٹی دل نے بھی بغاوت کر دی۔اُسے الہام ہوا کے طور کا جھلسا ہوا پرندہ ایک ناخوشی شبے اور شک کی حالات میں پرواز کر گیا ہے تو وہ۔۔۔بُدھ پکھیرو تو اُس کا بھی بزرگ تھا۔وہ تب وجود میں آیا جب طور کی چوٹی پر ابھی اُس جھاڑی کا بیج بویا ہی نہ گیا تھا۔وہ بھی مائل پرواز ہوا"۔(۹)

بُدھ پرندے کو باقی پرندوں کی اُڑان کی خبر پہنچی تو اُس کے دل میں بغاوت نے جگہ پائی۔جہاں کہیں بھی ایسے پرندے موجود تھے اُن کے دلوں میں شک و شبہ نے جب تحریک پیدا کی تو وہ اُڑان بھر کر باقی پرندوں سے اظہار یکجہتی کرتے ہوئے اپنی منزل ٹلہ جوگیاں کی طرف روانہ ہوئے۔سب پرندوں نے اس کھٹن اور دشوار گزار راستے پر سفر کا ارادہ کیا۔

بنیادی طور پر ناول منطق الطیر جدید کی کہانی صوفی ازم، تصوف، و عرفان کے گرد گھومتی ہے تاہم اس میں صوفیانہ عناصر کو عام روایت سے ہٹ کر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔پرندے جو کہ مختلف مذاہب کی نمائندگی کرتے ہوئے سیر و سلوک کی منازل کو طے کرتے ہیں اور تاریخی و مذہبی مقام ٹلہ جوگیاں پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔تصوف کا یہ سفر اُس وقت شروع ہوتا ہے جب عالمی مذاہب کے پرندے بطور علامت مختلف مذاہب کی ترجمانی کرتے ہوئے ٹلہ جوگیاں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔یہی وہ فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ پرندے شک کی بناء پر بغاوت کی راہ اختیار کرتے ہوئے نئے سچ کی کھوج میں پرواز کرتے ہیں۔اس ناول میں تصوف اور مذہبی روایات کو پرندوں کی زبانی خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔مصنف نے ٹلہ جوگیاں کی ایک خواب سی دُنیا کو تخلیق کیا۔اس دُنیا میں مذہبی روایات اور تاریخ سے نکلنے والے مختلف کرداروں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔اگر تصوف کا موازنہ دیگر مذاہب سے کیا جائے تو ایک بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ تصوف ہر مذہب میں موجود ہے۔بُدھ مت کے صوفیاء (بھکشوں) نے باقی مذاہب میں موجود صوفیاء کی تعلیمات کو اپنے مذہب میں رائج کیا۔بُدھ کے سب سے پہلے بانی اور صوفی سدھارتھ (گوتم بُدھ) ہیں۔جنہوں نے زندگی کی سہولیات اور آسائشوں سے منہ موڑ کر تنہا جنگلوں میں رہنے کا ارادہ کیا اور اس ضمن میں "گیا" کے جنگلوں میں مختلف ریاضتیں کیں۔مستنصر حسین تارڑ منطق الطیر جدید میں سدھارتھ کے

بارے میں رقمطراز ہیں۔

"جیسے سدھارتھ کی راکھ سینکڑوں کوزوں میں بند کر کے ،ہاتھیوں کے ذریعے پُوری سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچایا گیا اور وہاں اُس راکھ کے ہر کوزے کو دفن کر کے اُس پر سنہری سٹوپے تعمیر کیے گئے"۔(۱۰)

گوتم کی وفات کے بعد بُدھ مت مذہب کو آگے مستقبل میں زندہ رکھنے کے لئے اہم ترین کام بُدھ مت کے صوفیاء(بھکشوؤں) نے کیا۔ جنہوں نے سدھارتھ کی تعلیمات کو دُنیا میں پھیلایا۔یہی وجہ ہے کہ اب بُدھ مت مذہب کا شمار دُنیا کے چند بڑے مذاہب میں ہوتا ہے۔ گوتم بُدھ کی تعلیمات میں اخلاقیات،بیوی کے حقوق، اولاد کے حقوق، دوسرے لوگوں کے ساتھ اچھائی کے ساتھ پیش آنا وغیرہ شامل تھا لیکن جنت اور دوزخ کے بارے میں،روح کے بارے میں اور موت کے بعد والی زندگی کے بارے میں جو حقائق تھے اُن رازوں سے وہ واقف نہیں تھے۔ سچائی سے وہ مکمل طور پر وہ آگاہی حاصل نہ کر سکے۔

"میں ایک مدت اپنے مہاتما کی پسلیوں میں گھونسلا بنائے مقیم رہا لیکن نہ وہ آخری سچ تک پہنچا اور نہ میں اُس سے آشنا ہوا۔ بھوک، تپسیا اور خلق خُدا سے الگ ہو کر جنگلوں میں اگر سچ مِلتا تو وہ مجھ پر آشکار ہوتا۔ اس میں عطارؒ کی پوٹلی میں پناہ گیر ہوا۔ کیا جانیے کہ جو کچھ "گیا" کے ایک درخت تلے مجھے نہ ملا وہ مجھے ٹّلہ جوگیاں کی چوٹی پر اُس قدیم زیتون کے درخت تلے نصیب ہو جائے"۔(۱۱)

گوتم بُدھ نے "گیا" کے جنگلوں میں مختلف ریاضتیں کیں اور چّلے کاٹے لیکن وہ اصل حقیقت کو نہ پا سکے۔ اُنہوں نے کسی جگہ اللہ تعالٰی کے وجود پر کبھی کُھل کر بات نہیں کی، جنت اور جہنم کی حقیقت کے وہ قائل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ نیک اعمال پر جزاء اور بُرے کام کی سزا، روح کی حقیقت سے ناآشنائی، ان سب باتوں کو بُدھ مذہب کے پیروکار نہیں مانتے تھے۔ حقوق العباد اور اخلاقیات کا درس دیا لیکن درپردہ حقائق سے لوگوں کو آگاہ نہیں کیا۔ بُدھ مت پر سچائی غالب نہ آئی اُس پرندہ کو بھی یہ خبر ہوئی گوتم بُدھ نے جو لمبے عرصے تک "گیا" کے جنگلوں میں مختلف ریاضتیں کیں اور آخر پیپل کے درخت کے نیچے علم حاصل ہوا تو بھی آخری سچ سے ناواقف ہے۔ وہ پرندہ اب بھی بے قراری کے عالم میں ہے اور اُس پرندے نے سچائی اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے عطارؒ کے پرندوں کے ساتھ یک جہتی کی، تاکہ وہ حقیقت اور سچ جو "گیا" کے جنگل میں پیپل کے درخت کے نیچے نہ مل سکا وہ سچ ہو سکتا ہے کہ ٹلہ جوگیاں کے زیتون کے درخت کے نیچے مل جائے۔ بُدھ پرندہ

باقی پرندوں کے ساتھ ٹلہ جوگیاں کی طرف روانہ ہوا۔ ہر پرندہ مائل پرواز تو ہوا لیکن ہر پرندہ اپنے اپنے انداز میں "اناالحق" کا نعرہ لگائے ہوئے ہے۔ جس کو مستنصر حسین تارڑ نے ناول میں کچھ یُوں بیان کیا ہے۔

> "اگر تم اُن سب پرندوں اور اُن میں وہ بُدھ پرندہ بھی شامل کر لو تو اُن کے بدن سے صرف ایک ایک لہو کی بوند ٹپکا لو اور اُسے کشید کر لو تو اُس مئے لالہ فام کے ہر قطرے پر "اناالحق" کی تختی نصب ہو گی"۔[۱۲]

ٹلہ جوگیاں کے تمام پرندے خواجہ فرید الدین عطار کی ڈور کے ساتھ وابستہ تو تھے لیکن مختلف صورتوں اور عقیدوں کے ساتھ وابستگی کو ظاہر کر رہے تھے۔ ہر پرندہ مختلف راگ اور گیت گا رہا ہے پر ان سب پرندں کے گیت کی دُھن نے ایک جیسی ہے۔ ان سب کی تعلیمات انسانیت کی فلاح کے لئے تھی۔ سب نے "اناالحق" کا نعرہ بلند کیا اور یہی دعوی کیا کہ وہی حق اور سچ کی طرف گامزن ہے۔

(ب) ہندومت مذہب کے حوالے سے

ہندومت مذہب کا شمار قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے۔ پوری دُنیا میں ہندووں کی اکثریت دو ممالک میں زیادہ ہے جو کہ نیپال اور بھارت ہیں۔ اس مذہب کی بنیاد بھارت میں رکھی گئی۔ دور حاضر میں ہندومت دُنیا کا تیسرا بڑا مذہب ہے۔ ہندومت کوئی ایک مذہب نہیں اور نہ ہی ہم اس کا ایک مذہب کا نام دیں گے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذہب مختلف قسم کے رجحانات، تصورات، توہمات، عقائد و نظریات، رسومات کے مجموعہ پر مشتمل مذہب ہے۔ یہ مذہب مختلف عقائد و نظریات پر مبنی ایک ایسا مرکب ہے، جو کہ ایک لمبے عرصے کے بعد جا کر مکمل اور تیّار ہوا۔ ہندومت مذہب کے پیروکار بتّوں کی پُوجا کرتے ہیں اور ہندومت کو برہمن ازم بھی کہتے ہیں۔ قدیم ہندو لوگوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ مورخین کی مختلف تحقیقات کے مطابق ۱۲۰۰ء ق م سے پہلے کے زمانے میں ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کوئی بھی ایسی قابل ذکر کتاب نہیں کہ جس کو تاریخی کتاب کہا جا سکے۔ ایسی کوئی تصنیف نہیں ملے گی کہ جس سے ہندوستان کے تاریخی حالات و واقعات کا جائزہ پیش کیا جا سکے۔ ہندووں کی ہزارہا جلدوں پر مبنی کتابیں، جو کہ اُنہوں نے تقریباً تین ہزار سال میں لکھی ہیں۔ اُن میں سے ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملے گا جو کہ دُرست قرار دیا جا سکے۔ ہندووں کی تاریخی کتُب میں یہ عجیب خاصیت نظر آئے گی کہ ہر چیز کو غلط اور غیر فطری انداز میں دیکھا گیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا زمانہ مسلمانوں کے حملوں کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے پہلے مورخ ہی مسلمان تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستانی لوگ اپنی قدیم روایات کو ہی اپنی تاریخ تصّور کرتے ہیں۔ تاریخ پر

ناقدانہ نگاہ نہیں ڈالی جاتی تا کہ حقیقت کا کھوج لگایا جاسکے۔ آج کے دور کی تحقیقات کے مطابق ہندوستان کے بارے میں آریاؤں کی آمد سے قبل مذہبی روایات کے بارے میں کوئی بھی مستند اور تفصیل کے ساتھ معلومات کے بارے میں آگاہی نہیں ہے۔ ہندومت مذہب کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ اُس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب وادی سندھ کی قدیم تہذیبوں موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی کھدائی کا کام کیا گیا تو اِس میں آریائی تمدن کے آثار ملے ہیں لیکن ان آثارات پر جو زبان کندہ ہے وہ اب تک نہیں پڑھی جا سکی۔ یہ زبان سمجھ سے بالا ہے۔ ہندو مذہب کے بارے میں جواہر لعل نہرو اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

> "ہندو لفظ آٹھویں صدی کی لکھی ہوئی ہندوستان کی ایک تنتری کتاب میں ملتا ہے یہ لفظ بہت پرانا ہے اور قدیم فارسی کتابوں اور اوستا میں موجود ہے۔ اس کے بعد اسے مغربی اور وسط ایشیاء کے لوگ ہزار یا اس سے بھی کچھ عرصے تک ہندوستان کے لئے یا دریائے سندھ کے اس پار رہنے والے لوگوں کے لئے استعمال کرتے رہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ دریائے سندھ کا پُرانا نام سندھو ہے اور یہ لفظ اُسی سے نکلا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ سے آگے چل کر ہندو بن گیا" (۱۳)

ہندوستان میں مذہب کے لئے "دھرم" کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آریا لوگ "دھرم" یا ویدک دھرم کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ مذہب ہندومت میں بلند عقیدے کے لوگ اور پست عقیدے کے لوگ شامل ہیں اور یہ آپس میں بالکل متضاد اور مختلف قسم کے ہیں۔ بنیادی طور پر ہندوستان میں قدیم روایات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں سے ایک برہمنی مت ہے اور جبکہ دوسرا ہندومت ہے۔ جہاں تک برہمنی مت کا تعلق ہے برہمنی مت سے مراد ایسی روایت ہے کہ جس کو دور ہندوستان میں آریائی لوگوں کی آمد کے بعد سے شروع ہو کر بُدھ مت اور جین مت مذہب کی عام اشاعت تک جاری رہا ہے۔ برہمن طبقے کو عام لوگوں میں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ برہمن طبقہ کے لوگوں نے آریائی طبقہ کے مذہبی شعور کی بھرپور نمائندگی کرتے ہوئے پرانے مذہبی اصولوں کی روشنی میں اس روایت پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور اپنا گہرا اثر قائم و دائم رکھا ہے۔ برہمنی مت میں وقت کے ساتھ ساتھ مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں لیکن یہ روایت ہندوستان میں کافی حد تک پھیلتی گئی ہیں۔ برہمنی مت کا دور ایک سنہری دور تھا اور یہ سب دور ویدک ادب میں شامل مذہبی حقائق کو کسی کی تخلیق نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس ادب کو شرتی (الہامی) قرار دیا جاتا ہے۔ ویدک کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے۔

"اس میں بیان کردہ سچائیاں، ابدی حقائق ہیں جو کہ اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہیں۔ قدیم رشیوں (روحانی شخصیتوں) نے اپنی اعلیٰ روحانیت کی بناء پر ان سچایئوں کو سن لیا تھا اور پھر ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ اسی لیے تمام ویدک ادب شرتی (سنا ہوا، الہامی) مانا گیا ہے اور یہ خُدا یا انسان کسی کا تصنیف کردہ نہیں، تمام کا تمام ویدک ادب یکساں طور پر مقدس اور شرتی میں شامل سمجھا جاتا ہے"۔[۱۴]

ویدک ادب دو طرح کی تقسیم سے مشہور ہے۔ علمی دل چسپی کی وجہ سے ایک تقسیم جو زیادہ مشہور ہے اور یہ ویدک ادب کے مختلف حصّوں پر مبنی تصانیف اور اُن کے موضوعات کے بل بوتے پر لکھی گئی ہے ۔اسی تقسیم کی وجہ سے ویدک ادب کا جو قدیم ترین حصّہ ہے وہ سمتا کہلاتا ہے۔ یہ اُن گیتوں کا مجموعہ ہے جو کہ قدیم آریائی دیوتاؤں اور دیوی کی شان میں بیان کیے گئے بھجنوں سے متعلق ہے۔ اس کے بعد جو ویدک ادب تصنیف کی شکل میں بیان ہوا اُس کو برہمن کے نام سے منسوب اور یاد کیا جاتا ہے۔ عام طور پر برہمن اپنے موضوعات کی بنیاد پر زیادہ تر آداب زندگی، قربانی، مذہبی رسومات کے ضابطوں اور قاعدے قوانین سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ویدک تہذیب کا شمار بھی ہوتا ہے۔ اس تہذیب میں ویدوں کی تخلیق ہوئی۔

"ویدک دھرم کی ترکیب پرانے زمانے میں اُن فلسفیانہ خیالات، نظام اخلاق اور رسوم کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ جن کا ماخذ وید تھا۔ جو لوگ ویدوں کو سند مانتے وہ ویدک دھرم کے ماننے والے کہلاتے تھے۔ ہندوستان کے قدیم لوگوں کو دراویدین کہا گیا ہے"۔[۱۵]

ہندو مت جہاں پر قدیم ترین مذہب ہے، وہی پر اس دھرم کی جڑیں قدیم ہندوستان کی تاریخ میں ویدی مذہب سے جا کر ملتی ہیں۔ مختلف عقائد و نظریات اور روایات سے بھر پور ہندو مذہب کے کئی بانی ہیں۔ اس مذہب کا بانی کوئی ایک فرد نہیں۔ اسی طرح ہندوؤں کی جو مذہبی کتب ہیں اُن کو کسی ایک فرد کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوؤں کے مذہبی نظام کی تشکیل میں بہت سے اشخاص کا حصّہ ہے۔ اس لیے اس کی رسومات، عبادت، قانون، اور سوم و شعائر میں کسی جگہ یکسانیت نہیں ملتی۔

ہندومت مذہب کے بنیادی عناصر

اِس مذہب کا شمار بھی قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے۔ ہندومت مذہب کی تاریخ بہت پرانی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اِس مذہب میں کافی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔

تصورِ خُدا

ہندومت مذہب کے لوگ ویسے تو کثیر خُداؤں کو مانتے ہیں لیکن وہ ایک بڑے خُدا (براہما) کو زیادہ تعظیم دیتے ہیں۔ "براہما" کو ایک ایسی ہستی تسلیم کیا جاتا ہے کہ جو پوری کائنات کو جانتی ہے اور وجود کے ہر حصّے میں رہتی ہے۔ براہما کو اکثر تین اشکال یعنی براہما (خالق) وِشنو (محافظ) اور شِوتباہ کرنے والے کے طور پر مانا جاتا ہے ہندومت کے علم الہیات کا خلاصہ کرنا مشکل ہے کیونکہ ہندو فرقوں میں ہر طرح کے الہیاتی نظام کے عناصر موجود ہیں۔

1۔ مونسِٹک

جن کا ماننا ہے کہ صرف ایک خُدا ہے یہ سنکارا فرقے کا عقیدہ ہے

2۔ پینن تھی اِسٹک

اِس فرقے کا ماننا ہے کہ دُنیا خُدا کا حصّہ ہے۔ یہ راجانُوجا فرقے کا عقیدہ ہے

3۔ تھی اِسٹک

جن کا ماننا ہے کہ واحد خُدا ہے جو تخلیق سے جُدا ہے یہ بھگتی ہندومت کا عقیدہ ہے۔

لیکن اگر فرقوں کا اگر مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مت دہریے (ذاتِ خدا کا انکار کرنے والے ہیں) الحاد پرست (اخلاقیات پر زور دینے والے اور فطرتی قوانین میں خُدا کی مداخلت کا انکار کرنے والے) ہیں۔ ہندومت مذہب کے لوگ انسانیت کو الٰہی مخلوق کے طور پر دیکھتے ہیں کیونکہ براہما سب کچھ ہے ہندو اِس بات کا دعوی کرتے ہیں کہ ہر کوئی الٰہی ہے۔ آتما خود براہما کے ساتھ ایک ہے۔ براہما سے ہٹ کر حقیقت کو صرف دھوکے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ایک ہندو انسان کا براہما کے ساتھ ایک ہونا ہے۔ اِس لئے اپنی فریب آمیز صورت میں وجود سے دستبردار ہونا "فرد کی خودی" ہے۔ اِس آزادی کو بطور "موکشا" پیش کیا جاتا ہے۔ جب تک موکشا حاصل نہیں ہوتا، ہندوٴ یہ ایمان رکھتا ہے کہ وہ بار بار پیدا ہوگا تاکہ وہ سچّائی کی

جانکاری کر سکے۔

پُوجا

پُوجا یا پُوجن ہندو مت کی ایک رسمی عبادت ہے جس میں ہندو خاص دیوتا یا دیوی کی تعظیم و تکریم کا بندوبست کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو تب بھی پُوجا کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ پُوجا کی رسم بدھ مت، اور جین مت میں بھی کی جاتی ہے۔

ہندوؤں کی مذہبی کتب

۵۰۰ ق م سے لے کر ویدک دور کے اختتام تک برہمنی دور کی نشاۃ ثانیہ پر مبنی ہندو مذہب کے ارتقاء ۴۰۰ عیسوی دور تک زمانے کو رزمیہ نظموں کا دور یا مہابھارت اور رامائن کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس دور کے مذہب اور معاشرتی جائزے کے لئے مہابھارت اور رامائن اہم ترین ماخذ ہیں۔ اس لئے ان ماخذات کا جائزہ بہت ضروری ہے۔

مہابھارت

مہابھارت" زیادہ طویل اور مختلف اقسام کے کردار کی حامل تصنیف ہے۔ سنسکرت زبان میں تحریر شدہ یہ طویل نظم اپنے دور کے بھارت کی بھرپور انداز میں تصویر پیش کرتی ہے۔ مہابھارت کو ہندو مذہب میں معتبر حیثیت حاصل ہے۔ بالحاظ موضوع انتہائی متنوع کتاب ہے جس میں جنگ ،دریا، محبت، مذہب ،راج، سب کچھ شامل ہے۔ یہاں پر لفظ " مہا" کی وضاحت ضروری ہے۔ اس ضمن میں قدیم اُردو لغت میں "مہا" کے معانی کچھ یوں درج ہیں۔ "مہا کے لفظی معانی بزرگ اور بڑا کے ہیں"۔[۱۶] "مہا" لفظ کے ان معانی کے علاوہ لغات میں اور معانی بھی ملتے ہیں۔ جیسے " کلاں ،کبیر، عظیم ، اعلیٰ، اور بھاری کے معانی بھی ملتے ہیں"۔[۱۷] "مہابھارت" رزمیہ کا مرکزی جو قصّہ ہے وہ راجا بھرت کے خلاف کوروؤں اور پانڈوں کے درمیان جنگ ہے۔ جو کہ تخت نشینی کے لئے لڑی گئی۔ لیکن اس واقعہ کے ساتھ اس کتاب میں اس قدر غیر متعلق روایات، واقعات، اور دوسرے قصّے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب قدیم ہندوستان کے بارے میں معلومات کا خزانہ تصّور کی جاتی ہے۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا میں مہابھارت کی وضاحت اجمالاً یوں بیان کی گئی ہے۔

> "ایک رزمیہ نظم ، مصنفہ ویاس جی، اس میں اٹھارہ کتب اور دو لاکھ پندرہ ہزار اشلوک ہیں۔ اصل موضوع پانڈروں اور کوروں کی لڑائی ہے جو کہ کورو چھیتر

میدان میں ہوئیے تھی۔ ضمناً برصغیر پاک وہند کے تمام قصّے اور لوک کہانیاں اس
میں بیان کر دی گئی ہیں"۔[۱۸]

مہابھارت کتاب میں ایسی روایات ملتی ہیں جو کہ قدیم ہندوستان کی مذہبی معاشرتی اور سیاسی حیثیت پر وضاحت کرتی ہیں۔اس کی مصنفہ کا نام ویاس جی ہے۔قدیم ہندوستان کے ادب کے بارے میں معلومات بنیادی طور پر ان دو رزمیہ میں نظر آتا ہے۔"یہ دونوں عسکری افسانے ہیں،علاوہ ازیں ان کتابوں میں دینیات،اخلاقیات اور حکمرانی کے موضوعات ہیں" [۱۹]ان کتابوں میں عسکری حالات وواقعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔جنگ کے قصّوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اخلاقی تربیت کا درس دیا گیا ہے۔اصل میں یہ دونوں خاندان کورو اور پانڈو دہلی شہر کے شمال مشرق میں ایک علاقہ ہتناپور تھا وہاں پر آباد تھے۔قبائلی علاقوں کی مانند ان دونوں خاندانوں میں پرانی دیرینہ دُشمنی چل رہی تھی۔کورو خاندان کا رئیس اعظم دریودھن تھا جبکہ کورو خاندان سو (۱۰۰) بھائیوں پر مشتمل تھا۔ان کے مخالف پانڈو خاندان کے صرف پانچ بھائی تھے۔ دریودھن ہمیشہ پانڈوں سے ناخوش رہتا تھا۔اُس نے پانڈوں کو شکست دینے کے بعد دارالحکومت سے نکال دیا تھا۔اُس کے بعد یہ پانڈوں دربدر ہر طرف گھومتے رہے یہاں تک کہ اُن میں سے ایک بھائی نے پنچال کے راجا کی لڑکی " دروپدی " سے شادی کرلی جو کہ پانچ بھائیوں کی مشترکہ بیوی تھی اور اس طرح مہابھارت کی ہیروئن ان پانچ بھائیوں کی مشترکہ بیوی بنی۔ان پانچ بھائیوں سے ایک بھائی نے قسم کھائی کہ وہ کوروؤں سے ضرور بدلہ لے گا۔اس کے بعد پانی پت میں کوروؤں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور پانڈوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ہندوستان میں بیشتر رائج روایات اور قصّوں کو مہابھارت میں جگہ دی گئی ہے۔مہابھارت کتاب کے بارے میں یہ کہنا بہتر ہو گا کہ صدیوں کے اضافے اور مختلف تبدیلیوں کے بعد مہابھارت تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں اپنی موجودہ شکل میں مکمل ہوگئی تھی۔اب موجودہ دور میں یہ ایک لاکھ اشعار پر مبنی کتاب تھی۔رامائن کے مقابلے میں مہابھارت میں زیادہ قدیم ماحول کی عکاسی وترجمانی کی گئی ہے۔

رامائن

رامائن کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہابھارت کتاب کے مقابلے میں رامائن زیادہ مہذب، شائستہ،ترقی پسند،اور مختلف اصولوں پر مبنی کتاب ہے۔رامائن میں رام چندر جی اور اُن سے متعلقہ لوگوں کے بارے میں ایک مستقل اور مربوط قسم کا قصّہ ہے۔مغربی بنگال کی روایات کی عکاسی رامائن میں کی گئی ہے۔یہ کتاب رام چندر جی کو دلیر اور بہادر انسان کے طور پر بیان کرتی ہے۔رام چندر جی کو خاص طور پر عزت وتکریم

دی گئی ہے۔اپنی بیوی کو کس طرح شوہر کے تابع ہونا چاہیے اس ضمن میں رام چندر جی کی بیوی "سیتا" کے کردار کا تعارف کرایا گیا ہے۔چندر رام جی کا کردار بطور شرافت، وعدہ کی پابندی، والدین کی خدمت، کے سلسلے میں مثالی کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔رامائن سنسکرت زبان میں ایک طویل رزمیہ نظم ہے۔رامائن میں کل اشعار کی تعداد ۲۴ ہزار ہے لیکن یہ کتاب مہابھارت کے مقابلہ میں بہت مختصر جبکہ معاملات کی بہتری کے حوالے سے زیادہ جامع کتاب ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مہابھارت اور رامائن کتاب میں آریائی اور غیر آریائی ہندوستانی عناصر سے مل کر اور برہمنی مت کے ذریعے پروان چڑھتے ہوئے ہندو مذہب کے ابتدائی دور کی تصویر کو پیش کرتے ہیں۔پروفیسر ہیرن کا مختصراً قصہ اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "یہ ہے چند لفظوں میں رامائن کی داستان اور اس سادہ بندش کی ترتیب اور تکمیل کا سرانجام ایسی خوبصورتی اور ندرت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ دُنیا کی بہترین شاعرانہ تصنیف کے مقابلہ میں اس کا پلہ رہے گا"۔[۲۰]

شاعرانہ انداز میں لکھی ہوئی یہ کتاب اپنی مثل آپ ہے۔ہندو مذہب کے آغاز کے بارے میں یہ کتاب کافی جامع معلومات بہم پہنچاتی ہے۔یہ کتاب ہندو معاشرے میں مقدس ترین کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔اس مشہور تصنیف کے بارے میں پرنسپل گریفتھ اپنے تاثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "رامائن ہر ایک ملک، قوم اور زمانہ کے لٹریچر کو ایسی نظم پیش کرنے کی با آواز بلند دعوت دیتی ہے۔جس میں رام اور سیتا جیسے کامل انسان ہو۔شاعری اور اخلاق میں ایسا دل آویز اتحاد اور کہیں نظر نہیں آتا جیسا کہ فی الواقع مقدس کتاب ہے"۔[۲۱]

اس تصنیف جیسی شاعرانہ طرز بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔یہ کتاب مختلف اقوام کو ایک کمال کی نظمیہ طرز سے متعارف کراتی ہے۔اس کا اُسلوب ایک نئے انداز میں ہے۔یہ کتاب ہندو معاشرے اور ہندو مذہب کی تاریخ سے عام قاری کو روشناس کرتی ہے۔

ہندو معاشرے کی ابتداء کی تاریخ کا احوال نہایت عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے لیکن اس کتاب کا جو اپنا زمانہ ہے اُس زمانے کا تعین کرنا کافی مشکل کام ہے۔یہ تصنیف کسی ایک شخص کی تحریر کردہ نہیں ہے بلکہ اس کتاب کے مختلف مصنفین ہے۔اس کتاب میں جہاں تاریخی احوال بیان کیا گیا ہے وہی پر رام چندر جی کی

اُن لڑائیوں کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے جو کہ اُس نے " روان" لنکا کے بادشاہ سے اپنی بیوی سیتا جی کو چھڑانے کے لئے لڑی ہے۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت درج کی جاتی کہ "روان" مستنصر حسین تارڑ کا ایک مشہور ناول ہے جو کہ اُنہوں نے وادی سندھ کی تہذیب کے بارے میں لکھا ہے۔

بھگوت گیتا

لفظ " بھگوت گیتا" سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔اس کے لفظی معنی ہے "مقدس نغمہ" کے ہیں۔ ہندو مذہب میں بہت مشہور اور اہمیت کی حامل یہ کتاب ہے۔" بھگوت گیتا "کو بارہ کتابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس کتاب کو مہابھارت کا ذیلی قصّہ قرار دیا جاتا ہے یہ وہ مکالمہ ہے جو ارجن اور کرشن کے درمیان اُس وقت ہوا جب مہابھارت کی لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ بھگوت گیتا میں اشعار کی تعداد ۷۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ محمد اکرام رانا بھگوت گیتا کے بارے میں لکھتے ہیں۔" بھگوت گیتا میں قریباً ۷۰۰ اشعار ہیں۔ جن میں فلسفہ، مذہب اور اخلاق و تصّوف کے زریّں اصول بتائے گئے ہیں"۔ (۲۲)

اس کتاب کو سری کرشن جی مہاراج کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔اس کے مصنف کے بارے میں بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔اب ہندو قوم سری کرشن مہاراج کو اپنی زندگی کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں اور اس طرح گیتا کی تعلیمات عام ہو رہی ہیں۔یہ تصنیف انسانی شعبہ ہائے زندگی کی مکمل رہنمائی کرتی ہے۔انسانی روح کے بارے میں اس کتاب میں درج ہے کہ تباہ و برباد نہیں ہوتی۔یہ ایک لافانی، ابدی اور قائم رہنے والی چیز ہے۔ جسم ختم ہو جاتا ہے لیکن روح کبھی ختم نہیں ہوتی۔ویدانت (توحید)فلسفہ کے بارے میں "گیتا" میں یہ واضح بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ہر چیز پر طاقت اور قدرت رکھتا ہے۔دُنیا میں جتنی بھی چیزیں موجود ہیں اُن کو قائم و دائم رکھنے والی ایک چیز ہے جو روح کہلاتی ہے اُس کو برقرار رکھنے والی ایک روح اعلیٰ ہے۔روح اعلیٰ سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ہندو آج بھی سب سے زیادہ تلاوت بھگوت گیتا کی کرتے نظر آتے ہیں اور سب سے زیادہ وہ سری کرشن جی کو اہمیت دیتے ہیں۔اُن کو اپنا مذہبی گرو تسلیم کرتے ہیں اور ہندو جو گیتا کی تلاوت کرتے ہیں وہ کرشن سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔اس چیز کو وہ اپنا نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

دیوی، دیوتاؤں کا ظہور

کائنات کی فطری قوتوں سے متعلق دیوی دیوتا ہے جیسے کہ "اِندر دیوتا" جس کو طوفان اور بجلی کا دیوتا کہا جاتا ہے۔"اگنی" دیوتا جس کو آگ کا دیوتا کہتے ہیں۔"سوریہ" سورج دیوتا جبکہ "سوم" (سوم کا پودا)

"وایو" جس کو ہوا کا دیوتا کہتے ہیں۔ یہ دیوتا ہندو مذہب میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان میں سے جو "اِندر دیوتا" ہے یہ بہت ہی قدیم دیوتا ہے۔ اس کو جنگ کا دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اندر دیوتا کی تخلیق کے بارے میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ پر اس کو آسمان اور زمین (پرتھوی) کا بیٹا بتایا گیا ہے جبکہ اس کے برخلاف آسمان وزمین کا خالق بھی بتایا گیا ہے۔ رگ وید میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ اندر دیوتا اور اگنی دیوتا یہ دونوں دیوتا کائناتی پرش کے منہ سے انہوں نے جنم لیا۔ یہاں پر پرش سے مراد اولیّن آدمی ہے۔ ابن حنیف اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں۔

> "یہ بھی لکھا ہے کہ اندر جب پرتھوی کے پہلو سے پیدا ہوا تو آسمان، زمین، پہاڑ لرز اُٹھے۔ سب نے محسوس کر لیا کہ یہ بچہ (اِندر) زبردست تبدیلیوں کا باعث بنے گا"۔ (۲۳)

مہابھارت کتاب میں اور رامائن میں بھی مذہبی زندگی پر چھائے ہوئے کچھ نئے قسم کے دیوی دیوتا دیکھائی دیتے ہیں۔ ان نئے دیوی، دیوتاؤں میں برہما، شیو، وشنو، شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دیوی ماں بھی شامل ہے جس کو زیادہ اہمیّت حاصل ہے۔ برہما، وشنو، اور شیو کو ایک ساتھ اکٹھا کر کے "تری مورتی" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ برہما اور وشنو اگرچہ ویدک ادب میں مذکور ہیں لیکن مہابھارت اور رامائن میں ان دیوتاؤں کی حیثیت میں خاص قسم کی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ اخیر دور کے ادب ویدک ادب میں "برہما" دیوتا جو کہ اکثر حقیقت اعلیٰ کے مترادف سب سے عظیم دیوتا کے طور پیش کیا جاتا ہے۔ "وشنو" بھی تاہم ویدک ادب میں ہے لیکن دوسرے نمایاں دیوتاؤں کے جھرمٹ میں وہ ایک بہت ہی مدھم ستارے کی مانند ہے۔ "تری مورتی" کے خیال میں "برہما" کائنات کی تخلیق کا ذمہ دار ہے تو پھر کائنات کی سلامتی اور اس کائنات کی پرورش کی ذمہ داری "وشنو" کے ذمہ ہے۔ اس طرح "وشنو" دیوتا کی اہمیّت بڑھ جاتی ہے۔ عصر حاضر میں بھی "وشنو" اپنی اور اوتاروں کی شکل میں سب سے زیادہ پوجا جانے والا دیوتا ہے۔ اسی طرح "شیو" دیوتا بھی اپنی خوبیوں کی بدولت "وشنو" سے واضح طور پر مختلف دیوتا ہے۔ "شیو" دیوتا کے بارے ہندو مذہب کے محققین کا یہ عام خیال ہے کہ اس کی عبادت کا رواج ہندوستان کی تاریخ میں بہت پرانا ہے۔ اور اتنا پرانا ہے کہ یہ قبل از آریہ زمانے سے تھا۔ مہابھارت اور رامائن موجودہ دور میں "وشنو" کی طرف داری والی کتابیں ہیں لیکن اُن میں جس ماحول کو مدنظر رکھا گیا ہے اُس میں "شیو" کی پوجا کو ہر طرف ہی چرچا نظر آتا ہے۔ "دیوی ماں" کی عبادت ہندوستان کی تاریخ میں قدیم ترین تصّور کی جاتی ہے۔ موہنجو داڑو اور ہڑپا

(سندھ) اس صدی کی ابتداء میں جو کھدائی ہوئی ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا یہ اس دور میں " دیوی ماں " کی پوجا عروج پر تھی۔اس دور میں بھی وشنو اور شیو کی طرح دیوی ماں کی عبادت ہندو مذہب کا اہم ترین تصّور ہے۔

ہندومت میں تصوف

ہندومت میں تصّوف ایسے ہی نظر آتا ہے جیسے کہ بُدھ مت میں تصّوف اور صوفیانہ عناصر کی جھلک واضح دیکھائی دیتی ہے۔ہندومت مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق نجات حاصل کرنے کے لئے مختلف طرح کی ریاضتیں کرتے تھے۔اس سلسلے میں مختلف اقسام کی عبادتیں کی جاتی۔ہندو ریاضت کے لیے ویرانوں، جنگلوں، اور مختلف غاروں میں چلے جاتے اور مختلف ریاضتوں سے اپنے جسم کو طرح طرح کی اذیت سے ہمکنار کرتے۔ سردی اور گرمی برداشت کرنا۔بارش میں گھومتے رہنا۔ گرم اور ریتلی زمین پر ننگے پاؤں سفر کرنا۔اپنی ریاضت کے لئے وہ یہ سب کچھ مقدس سمجھتے اور عقیدت کے طور پر ایسا فعل کرتے۔ نجات حاصل کرنے کے لئے مختلف جسمانی ریاضتوں کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب میں روحانی اور ذہنی اذیتوں اور مشقتوں کو بھی ذریعہ بنایا جاتا۔کچھ لوگ ننگے بدن کے ساتھ زندگی بسر کرتے۔ جسم پر خاک مَل لیتے ،بھیکاریوں کی طرح بھیک مانگ کر گزارہ کرتے ۔ہندوؤں سادھوں کی ایک کثیر تعداد پہاڑوں، جنگلوں، دریاؤں، میں زندگی بسر کرتی۔ان سادھوں کو ہندو معاشرے میں بلند مقام حاصل تھا اور ان کی باقاعدہ پرستش کی جاتی۔روحانی طاقت حاصل کرنے ریاضت کا ایک نیا طریقہ "یوگا" متعارف کرایا گیا۔ جس پر تینوں مذاہب کے لوگ چاہے اُن کا تعلق بدھ مت سے ہو، ہندومت سے ہو یا پھر جین مت سے عمل پیرا ہوتے۔ہندو مذہب میں تصوف کے بارے میں ڈاکٹر محمد اکرم رانار قمطراز ہیں۔

> " یوگ کی تعلیم نظری نہیں بلکہ عملی تھی۔اس میں عقل کو مادی پابندیوں اور روح کو جسم کے قید خانے سے آزاد کرنے کی ترکیبیں بتائی جاتی تھیں۔ جن پر عمل کرنے سے نجات حاصل ہو سکتی تھی، ریاضت اور دھیان کے ذریعے جسم اور حواس پر قابو پانے کے لئے مشقتوں اور عملوں کا چرچا عام تھا۔یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسان یوگ کے ذریعے اپنی قوت اور اختیار کو بہت بڑھا سکتا ہے، پانی پر چل سکتا ہے، ہوا میں اُڑ سکتا ہے، ذہنی قوت کو اتنا بڑھا سکتا ہے کہ غیب کا علم ہو جائے۔اس لئے یوگیوں سے بہت مرعوب رہتے تھے"۔(۲۴)

ریاضت کے اس طرز میں "یوگی" اتنی دیر تک سانس روکے رکھتے کہ عام انسان کو یہ شبہ ہو جاتا کہ شاید موت رونما ہوگئی ہے۔یوگی لوگ دودو تین تین دن بھوکے رہتے۔طویل فاقوں کے بعد بھی وہ زندہ رہتے۔" یوگا" عبادت کے لئے سب سے خطرناک منظر دیکھنے کو یہ ملتا ہے کہ یوگیوں اور سادھوں کو ننگے پاؤں انگاروں پر چلایا جاتا اور وہ بغیر جلے یا کوئی جلن محسوس کیے بغیر باہر نکل آتے۔اسی طرح وہ سورج کی تپش پر گھنٹوں کھڑے رہتے۔ مسلسل اپنے آپ کو اُلٹے لٹکائے رکھنا۔اپنے آپ کو اس قدر اذیت اور تکلیف دینا کہ جسم سوکھ کر بالکل ڈھانچہ بن جائے۔اس کے علاوہ عبادت کے لئے جنتر منتر جیسا طریقہ اپنایا، جنتر منتر کے ذریعے عبادت کرنا۔مذہب کے نام پر من گھڑت مذہبی رسومات منانا، مکروہ قسم کی حرکات کے ذریعے عبادت کرنا یہ سب کچھ ہندو تصوف میں شامل تھا۔جیسے مسلمان معاشرے میں قطب، غوث، ابدال، کی طرح فقیر اور درویش بزرگ ہستیاں ملتی ہیں اسی طرح ہندو معاشرے میں اُن کی بزرگ شخصیات ملتی ہیں جن میں مہاتما، اوتار، سادھو، سنیاسی، منی، رشی، گیانی، شاستری جیسے بزرگ ملتے ہیں جن کو مافوق الفطرت طرز کے اختیارات اور قوتیں حاصل تھیں۔"گیتا" ہندو معاشرے میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل کتاب ہے۔اس کتاب میں ہندو مذہب کے تصوف یعنی کہ صوفی ازم کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔" گیتا" کتاب میں زندگی کو جس طرح بسر کرنے اور اُس کے مسائل کو حل کرنے کا جو سبق دیا گیا ہے۔اُس سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ ہندو مذہب میں کرشن کی حیثیت ایک کامل مرشد کی ہے اور وہ اپنے مریدین کو راہ سلوک کی منزلوں کو طے کرنے کا سلیقہ سکھا رہے ہیں۔ہندو مت میں تصوف سے مراد یہی ہے کہ انسان بیوی، بچوں سے علیحدہ ہو کر جنگلوں میں سکونت اختیار کر لے۔دُنیا سے مکمل طور پر لاتعلقی اختیار کر لے۔تصوف کے لئے ہندوؤں کے ہاں ایک باقاعدہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کو وہ "سنیاس" کہتے ہیں۔

منطق الطیر جدید میں ہندو مت صوفیانہ عناصر کا تذکرہ

ہندو مذہب میں بھی صوفیانہ عناصر جابجا ملتے ہیں۔تصوف کی جھلک ہر الہامی و غیر الہامی مذاہب میں پائی جاتی ہے۔منطق الطیر جدید ناول کے مطابق مختلف مذاہب کے پرندے مرکز ٹلہ جوگیاں کی طرف آتے ہیں۔اُن کا یہ سفر حق اور سچائی کو تلاش کرنے کے لئے تھا۔پرندوں کا یہ سفر اپنے اندر پورے ایک جہاں کی تاریخ لئے ہوئے ہے اور تاریخی تناظر میں اگر ٹلہ جوگیاں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ٹلہ جوگیاں تاریخ کا ایک روشن اور یادگار باب ہے۔یہ ہزارہا سالوں کی تاریخ کا نایاب اور دلفریب نمونہ ہے۔ٹلہ

جوگیاں کی تاریخ کے بارے میں کوئی حتمی رائے اخذ نہیں کی جاسکتی، تاہم یہ وہ ٹلہ ہے جس میں تاریخ کی بہت ہی نامی گرامی اور مشہور شخصیات نے پڑاؤ کیا۔ اس ٹلہ جوگیاں کی طرف بُدھ مت یوگی بھی آئے، ہندو مت یوگیوں نے بھی اس کو اپنا مسکن بنایا۔ مستنصر حسین تارڑ ہندو یوگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُنہوں نے بھی ٹلہ جوگیاں کی طرف سفر کیا۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"اُن میں جوگی گورکھ ناتھ ہے جو سنکھ پھونکتے اپنے کان پھاڑ کر تقریباً دو ہزار برس پیشتر جانے کہاں سے اور کدھر سے ادھر آنکلا۔ اس ٹیلے کی چوٹی کی تنہائی اور ایک چپ کے اندر دھونی رمائی اور براجمان ہو گیا۔ گورکھ ناتھ کے پھٹے ہوئے کانوں میں سے جو خون رستا تھا۔ اُس کی ہر بوند میں سے انا الحق کی صدا آتی تھی۔ جو صدیوں بعد بغداد کے حلّاج کے کانوں میں ایک اذان کی صورت بلند ہوئی اور اُس نے نماز عشق قضاء نہ کی، اپنے لہو سے وضو کر کے سرخرو ہوا"۔ (۲۵)

ہندوستانی ادب اور معاشرے پر تصوف کی روایت کافی پرانی ہے۔ ویدانتی مذہبی ادب کا ایک بہت بڑا حصّہ متصوفانہ سوچ پر مبنی ہے۔ پنجاب میں گورکھ ناتھ نے عام انسان کو نجات دلانے کے لئے مختلف صوفیانہ کاوشیں کیں، گورکھ ناتھ گیارویں صدی کی ابتدا میں ایک ہندو یوگی اور صوفی تھا۔ اُس کے دور کے بارے میں کوئی حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا۔ گورکھ ناتھ " ناتھ " روایات کا بانی تھا۔ گورکھ ناتھ کی تعلیمات کے مطابق اس جہان میں رہنے والے تمام انسان برابر ہیں۔ ہندوؤں کی تمام مذہبی کُتب محض تصّوف کا ایک خیال یا نظریہ نہیں بلکہ یہ ایک پُورا نظام حیات ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مذہب میں صوفی ازم پُرانے زمانے سے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے ٹلہ جوگیاں دو ہزار سال قبل ہندوؤں کا ایک بہت ہی مقدس مقام سمجھا جاتا تھا۔ یہ عمارت پہلی صدی عیسوی میں تعمیر کی گئی۔ گورکھ ناتھ جو کہ کن پھٹے جوگی کے نام سے مشہور ہُوا۔ اُس نے بھی ٹلہ جوگیاں میں ڈیرہ لگایا۔ یہی روایت صدیوں بعد منصور حلاّج میں نظر آئی، حلاج نے بھی "میں ہی حق ہوں" کا نعرہ لگایا۔ اُس نے بھی عشق کی نماز کو قضا نہ کیا۔ اس طرح صوفی ازم کی یہ روایت اُس دور سے جاری و ساری ہے اور اسی طرح صوفی ازم کی ایک اور زندہ مثال جو کہ بھرتری ہری سے منسلک ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے منطق الطیر جدید میں بیان کی ہے۔

"راجہ چندر سین کا لاڈلا فلسفی اور شاعر بیٹا بھرتری ہری، مولانا روم، جاوید نامہ میں علامہ اقبال سے اُس کا تعارف کرواتے ہیں۔۔۔۔ کہ اس سے ملو، نوا پرداز

ہندی نکتہ آرا اور نوائے ارجمند رکھنے والا ہے۔ اور جس کا فقر میں ایک بلند مقام
ہے اور وہ خود جم اور اُس کے شعر جام جم ہیں"۔[۲۶]

بھرتری کا شمار ہندوستان کے قدیم حکمران طبقے میں ہوتا ہے، اُس کا تعلق مشہور حکمران خاندان "گیتا" سے تھا۔ راجہ بھرتری اپنی تمام رانیوں میں سے "پنگلا رانی" سے حد درجہ محبت کرتا تھا۔ راجہ کا بھی یہی خیال تھا کہ اُس کی رانی اُس سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ بھرتری ہری سنسکرت زبان کا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ بھرتری ہری کا زمانہ پہلی صدی عیسوی قبل مسیح کا ہے۔ اُس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا جس کا دارالحکومت "اجین" تھا۔ بھرتری ہری ایک فلسفی، ماہر لسانیات، نجومی، اور شاعر تھا۔ راجہ بھرتری ہری کی زندگی سے متعلق ایک بہت ہی مشہور منسوب حکایت ہے۔ واقعہ کچھ یُوں تھا کہ بھرتری ہری کو پنڈت نے ایسا پھل دیا کہ جسے کھانے سے انسانی زندگی بڑھ جاتی ہے۔ بھرتری ہری نے وہی پھل اپنی پیاری بیوی "مہارانی پنگلا" کو دیا۔ مہارانی پنگلا حقیقت میں شاہی سائیں کے عشق میں گرفتار تھی۔ اُس نے وہی پھل اُس سائیں کو دے دیا، آگے اُس سائیں کے کسی طوائف سے تعلقات تھے اُس نے وہی پھل اُس طوائف لڑکی کو دے دیا۔ طوائف نے راجا بھرتری ہری کی محبت حاصل کرنے کے لئے پھل بھرتری ہری کو دیا۔ بھرتری ہری نے وہ پھل پہچان لیا اور یوں بھرتری ہری پر اپنی بیوی کی بے وفائی عیاں ہو گئی۔ مہارانی کی بے وفائی نے راجہ کی زندگی یکسر بدل کر رکھ دی۔ راجہ بھرتری ہری نے شاہی زندگی کو خیر آباد کہہ دیا اور ایک فقر کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ اُس نے جنگلوں میں سکونت اختیار کر لی۔

بھرتری ہری سے دو کتابیں منسوب کی جاتی ہیں ۔جن میں "واکیہ پادیہ" اور دوسری کتاب "شکترایہ" شامل ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال بھی بھرتری ہری کو بہت پسند کرتے تھے۔ اقبالؒ بھرتری ہری کے قول و فعل سے حد درجہ متاثر تھے۔ اقبالؒ نے بھرتری ہری کے فکر و عمل سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ بھرتری ہری کی فکر اقبالؒ کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب " "بال جبریل" کی ابتداء بھرتری ہری کے اس شعر کے ساتھ کی۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر

اس شعر کے بارے میں قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس شعر کا ترجمہ کیا ہے۔ اقبالؒ نے اپنے کلام کو بھرتری ہری کی فکر سے بھی مزین اور خوبصورت کیا ہے۔ بہرحال بھرتری ہری نے بھی جب

جوگی کا روپ دھارا تو اُس نے بھی ٹلہ جوگیاں جو کہ شروع سے ہی جوگیوں کا مرکز رہا ہے یہاں کا رُخ کیا۔ بھرتری ہری کی بھی ٹلہ جوگیاں کے ساتھ پرانی نسبت ہے اور یہاں پر اُن کی سمادھی بھی موجود ہے۔ بھرتری ہری کا ہندو فقر میں خاص رتبہ اور مقام ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے مزید ہندوازم کے صوفیانہ عناصر کو واضح کرتے ہوئے سیالکوٹ کے راجہ سلوان کے بیٹے پُورن کا ذکر کیا ہے کہ پُورن نے کیسے ٹلہ جوگیاں کی سمت سفر کیا اور وہ کیسے ایک بھگت بنا۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"سیالکوٹ کے راجہ سلوان کا بیٹا پُورن، اکلوتا، اور سہکواں، پیدائش پر پنڈت راجہ سلوان سے کہتے ہیں کہ اسے بارہ برس تک کسی کی نظر نہ لگے، اندھیری کوٹھڑی میں لوگوں کی آنکھوں سے بچائے رکھو۔ اُس کی ماں برہا کی ماری رانی اچھراں دل پر پتھر رکھ کر پنڈتوں کا فیصلہ قبول کر لیتی ہے۔ پُورن جوان ہو کر اپنے اندھیارے سے جب نکلتا ہے تو اُس کی سوتیلی ماں رانی لُونا اُس پر عاشق ہو جاتی ہے۔۔۔ پُورن جب رانی لُونا کے بدن کی پیاس بجھانے سے انکاری ہو جاتا ہے تو رانی راجہ سلوان کے سامنے ایک مکرانی کے روپ میں پُورن پر الزام دھرتی ہے کہ اُس نے اُسے بے حرمت کرنے کی کوشش کی تھی۔ راجہ صاحب نوجوان اور خوبصورت رانی لُونا کے دام میں آجاتے ہیں اور پُورن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اُسے ایک اندھے کنویں میں پھینک دیتے ہیں۔ مدتوں بعد اُدھر سے جوگی گورکھ ناتھ کا گزر ہوتا ہے۔ وہ پُورن کو کنویں سے نکال کر اُس کے ہاتھ پاؤں بحال کر دیتا ہے اور اُس کے کان پھاڑ کر اپنا جوگی بنالیتا ہے۔ پُورن جو اب ایک بھگت ہو چکا ہے وہ اپنے گوروؤں کی سنگت میں ٹلہ جوگیاں جا بسیرا کرتا ہے"۔[۲۷]

پُورن اُس اندھیرے کنویں میں زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوتا ہے تو ایک دن وہاں سے ہندو مذہب کے گرو اور صوفی گورکھ ناتھ کا گزر ہوتا ہے۔ گورکھ ناتھ کے ایک چیلے نے پُورن کو کنویں میں دیکھا اور گرو گورکھ ناتھ کے حکم کے مطابق اُس کو کنویں سے باہر نکالا۔ پُورن نے اپنی تمام روداد گورکھ ناتھ کو سنائی تو وہ بہت غمزدہ ہوا۔ گورکھ ناتھ نے پُورن کے معذور جسم پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ معجزاتی طور پر بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اُس کے بعد پُورن بھی گورکھ ناتھ کا ہم سفر بن گیا۔ اُس نے بھی ایک صوفی کا رنگ اپنا لیا اور اپنے گرو کے ساتھ ٹلہ جوگیاں جا کر ٹھکانہ لگا لیا۔ پُورن کے گیان دھیان نے اُس کو ایک بھگت کے روپ میں ڈھال

دیا۔ جب وہ واپس سیالکوٹ آیا تو لُونا پُورن کی سوتیلی ماں اُس کے پاؤں گر گئی۔ پُورن کی دُعا سے لُونا کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا اور یُوں پُورن لوگوں کو اولاد دینے والا ایک بھگت اور جوگی کے طور پر مشہور ہوا۔

ناول منطق الطیر جدید کے مرکزی کردار موسےٰ حسین کو بھی جب اولاد کی تمنا ہوتی ہے تو وہ بھی پُورن کے کنویں کا رُخ کرتا ہے۔

> "موسےٰ حسین ابھی تک آرزومند تھا، اُس نے جب پُورن کے کنویں کی یاترا کے لئے اُسے مائل کرنا چاہا تو وہ پھٹ پڑی۔۔۔ موسےٰ تنہا آیا۔ پُورن کے کنویں کی چار دیواری کے نزدیک جنگلی جھاڑیوں کی اُوٹ میں سے اُن سلگتے پیراہنوں میں سے دھواں اُٹھتا تھا جو اولاد کی خواہش کرنے والی عورتوں نے اشنان سے پیشتر اُتار پھینکے تھے۔ اُنہیں نذر آتش کر دیا تھا۔ موسےٰ نے کنویں کی منڈیر سے اُس کی گہرائی میں آنکھیں اُتاریں، پانیوں پر گلاب کی پتیاں مردہ بیر بہوٹیوں کی مانند بے جان تیرتی تھیں"(۲۸)

پُورن بھگت ہوا تو وہ ٹلہ جوگیاں سے واپسی پر جب وہ سیالکوٹ آیا تو وہ ایک اولاد دینے والا بھگت مشہور ہوا۔ پُورن کے کنویں پر لوگ اولاد کی غرض سے آتے تھے۔ موسےٰ حسین کو اولاد کی آرزو ہوتی ہے تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر پُورن کے کنویں کی یاترا کے لئے تیاری پکڑتا ہے۔ پہلے اُس نے اپنی بیوی کو بھی اس سفر کے لئے آمادہ کرنا چاہا لیکن ناکام ہوا۔ انکاری پر موسےٰ حسین نے خود پُورن کے کنویں پر اولاد کے لئے جانے کا فیصلہ کیا۔ اولاد کی خواہش کرنے والی ہندو عورتیں وہاں پر غسل کرنے سے پہلے جو کپڑے اُتار کر پھینک دیتی تھی وہ پُورن کے کنویں کی چار دیواری کے نزدیک جنگلی جھاڑیوں میں جلا دیئے جاتے۔ یوں پُورن کا کنواں لوگوں کے لئے مقدس ٹھہرا۔ مستنصر حسین تارڑ پُورن کے صوفی ہونے پر مزید لکھتے ہیں۔

> "یُوں آج تک نہ کسی نے تحقیق کی اور نہ ہی اس بھید سے آگاہ ہونے کی جستجو کی کہ ہر دور میں مہدی یا مسیحا کا ظہور ہو نہ ہو، جیسے کوئی نہ کوئی قطب موجود ہوتا ہے ایسے کوئی نہ کوئی حلّاج بھی موجود ہوتا ہے۔۔۔ اور یُوں پرکھ کیجیے تو راجہ سلوان کا بیٹا پُورن اپنے عہد کا حلاّج اس لئے ٹھہرتا ہے کہ اُس نے بھی "میں ہی حق ہوں" کا نعرہ بلند کیا، سوتیلی ماں رانی لُونا کے دامن کو دریدہ نہ کیا جس کی پاداش میں حلاّج کی مانند اُس کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹ دیئے گئے۔ وہ صلیب پر نہ چڑھایا گیا۔ ایک کنویں میں اپنے بھائی یوسف اور بہن طاہرہ کی مانند دفن کیا

گیا"۔(۲۹)

آج تک کسی نے اِس راز کو نہیں جانا کہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی قطب، ابدال اور غوث موجود رہا ہے۔ یہ روایت صدیوں سے موجود رہی ہے اور چلتی جارہی ہے۔ ہر مذہب میں صوفیانہ عناصر پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب میں صوفی کا اپنا ایک رنگ اور انداز ہے۔ ہر صوفی نے مختلف طریقے سے رب کی حقیقت کو پانے کی جستجو کی اور ہر کسی نے اپنے مشاہدے اور اپنے طریقے سے سچائی کو تلاش کیا۔

یوں ہر دور میں کوئی نہ کوئی پُورن رہا ہے، کوئی نہ کوئی حلاج موجود رہا ہے۔ جو کچھ پُورن کی ذات میں تھا وہی کچھ صدیوں بعد بھی منصور حلاّج میں نظر آیا اور یوں صوفی ازم کی روایت ابتداء سے ہی چلتی آرہی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے صوفی کو بہت وسیع تناظر میں دیکھا ہے۔ در حقیقت تصوف ہر مذہب کے اندر موجود ہے اور ہر مذہب کے صوفیاء نے اس کو مختلف انداز میں اپنایا ہے لیکن یہ روایت صدیوں پرانی ہے۔ سب صوفیاء نے انسانیت کی فلاح کو مقدم رکھا ہے۔ پُورن نے آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل "انا الحق" کا نعرہ بلند کیا۔ یُوں پُورن اُس دور کا منصور حلاج تھا۔ جو نعرہ صدیوں بعد حلاج نے لگایا اُس نعرے کا وجود کئی سو سال پہلے پُورن کی شکل میں موجود تھا۔ پُورن کے بھی ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے تھے اور اُس کو ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ جیسے حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینکا گیا اور قراۃ العین طاہرہ کو کنویں میں پھینک دیا گیا تھا۔ ان تینوں کا زمانہ مختلف ہے لیکن انہوں نے اپنے عہد میں تصوف کی روایت کو برقرار رکھا۔ اس بارے میں مستنصر حسین تارڑ ناول منطق الطیر جدید میں لکھتے ہیں۔

> "پُورن کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹ ڈالے گئے۔ اُسے صلیب پر نہ چڑھایا گیا۔ ایک کنویں میں گرا دیا گیا اور پُورن اُس کنویں کی پاتال میں تھا جب اُس کے بریدہ اعضاء میں سے جو لہو پھوٹتا تھا۔ اُس کی کسی ایک بوند میں سے ایک پرندے نے جنم لیا۔ اُس کی اندھیاری کائنات کی تنہائی میں اُس کا ساتھی ہو گیا۔ اُسے تب تک گیت سناتا رہا جب تک کہ گورکھ ناتھ نے وہاں سے گزرتے ہوئے اُس کنویں میں جھانک نہ لیا"۔(۳۰)

پُورن کی جب رانی لُونا نے شکایت کی کہ اُس نے رسوا کیا ہے اور میری عزت پر ڈاکا ڈالا ہے تو راجہ سلوان نے پُورن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اُس کے جسم سے اعضاء کو الگ کر دیا۔ پُورن کے ساتھ ظلم ہوا تو اِس مظلومی کے عالم میں اُس کے خون کی بوند میں سے ایک ایسا پرندہ پیدا ہوا کہ جس نے پُورن کے خون کو سہارا

دیا۔ وہ پرندہ پُورن کے لئے رحمت بن گیا اور وہ پرندہ اُس وقت تک سلامت رہا جب تک گورو گورکھ ناتھ کا اُدھر سے گزر نہیں ہوا۔ یہ پرندہ پُورن کے لئے اُمید کی ایک کرن تھا۔ گورکھ ناتھ نے اُس کے ہاتھ پاؤں اپنے معجزاتی عمل سے بحال کیے اور پُورن کے کان پھاڑ کر اُسے اپنے ساتھ جوگیوں کی سرزمین ٹلہ جوگیاں ساتھ لے گیا۔ جہاں پر پُورن نے اپنے روحانی مرشد کے ساتھ قیام کیا۔

"پُورن کے کنویں پانیوں کی سطح پر تیرتی سُرخ بیر بہوٹی گلاب کی پتیوں میں سے ظاہر ہونے والا وہ لال لال پنچھی تھا، جس نے ٹلہ جوگیاں، ٹلہ جوگیاں کی سرگوشی کی تھی اِدھر آنے کا مشورہ دیا تھا"۔[۳۱]

پُورن کو کافی عرصہ کنویں میں رہنا پڑا۔ کنویں میں موجود سُرخ بیر بہوٹیوں میں سے گلاب کی پتیوں میں سے ایک ایسا سُرخ پرندہ نمودار ہوا کہ جس نے ٹلہ جوگیاں کی طرف سفر کرنے کا مشورہ دیا جو پُورن کے کان میں ٹلہ جوگیاں، ٹلہ جوگیاں کا ورد کرتا رہتا تھا۔ اِس پرندے نے پُورن کے دل میں ٹلہ جوگیاں جانے کی خواہش پیدا کی جو گورو گورکھ ناتھ کے توسط سے پُوری ہوئی۔ ناول نگار نے ہندومت کے صوفیانہ عوامل میں جہاں پُورن کا تذکرہ کیا ہے وہی پر کرشن کے صوفیانہ پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس بارے میں مستنصر حسین تارڑ نے لکھا ہے

"بہت آئے اور آخر میں ایک ایسا کرشن آیا جو ذرا نازک ملوک تھا۔ جس کی لٹیں مکھن سے چپڑی ہوئی تھیں۔۔۔ لیکن گائیوں کے نہیں، دریائے چناب کے کناروں پر چرنے والی اُن بھینسوں کے مکھن سے جو جنگل بیلوں میں اُگی ہوئی خود رو بھنگ کے بوٹوں پر منہ مارتی مست ہوتی تھیں اور اُس کے ہاتھوں میں بھی کرشن کی مانند ایک ونجلی تھی۔۔۔ کسی پتھر پر اُس کی نشانیاں بھی ثبت تھی اور پہچان یُوں ہوئی تھی کہ اگر اُس پتھر کے ساتھ کان لگا کر سنو تو اُس میں سے ونجلی کی ایک صدا آتی تھی۔[۳۲]

ناول نگار نے یہاں پر ایک مشہور کردار رانجھے کا ذکر کیا ہے جو کہ ایک جوگی تھا جس کے خوبصورت لمبے بال دریائے چناب کے کناروں پر چرنے والی مست بھینسوں کے مکھن سے چپڑے ہوئے تھے۔ کرشن بھگوان کی طرح اُس کے ہاتھوں میں بھی ایک ونجلی تھی۔ جس سے نکلنے والی عشق حقیقی کی سُریں پُوری فضاء میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس کا عشق اتنا صادق اور جذبہ اتنا پاکیزہ تھا کہ ہر جاندار و بے جان چیز پر اُسکی مہر ثبت ہو چکی

تھی وہاں پر موجود بے جان پتھر بھی اس کی سچی لگن اور بے لوث چاہ کی گواہی دیتے تھے۔ یہ وہ کردار تھا جس نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر کیا اور اپنے سچّے محبوب کو پالیا۔ عشق کی آگ اس قدر بھڑکی کہ اُس نے ٹلہ جوگیاں کا رُخ کیا اور اپنے اندر کے بے چین جوگی کی پیاس کو اس ٹلے کی پُر سکون فضا میں بجھایا۔

اس کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے ہندوؤں کے رحم، محبت، اور شفقت والے دیوتا کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے کرشن کی ونجلی (بانسری) اور رانجھے کی ونجلی کی بات کرتے ہوئے ان دونوں ہستیوں کے صوفیانہ پہلوؤں کو عیاں کیا ہے۔ کرشن کا مقام ہندو معاشرے میں بہت بڑا ہے۔ کتاب "بھگوت گیتا" کرشن ہی کی تعلیمات کا ایک خلاصہ ہے۔ کرشن کے حالات زندگی کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ متھرا کے "کالنگر" (کنس) کو اُس دور کے نجومی اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ اُس کی بہن "دیوکی" کا جو آٹھواں بیٹا ہوگا وہ اُس کو بادشاہت سے محروم کر دے گا اور اُس کا تخت و تاج چھین لے گا۔ اس بنا پر وہ اپنی بہن کے تمام بچّوں کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا لیکن اُس کا آٹھواں بچّہ کرشن (وشنو کا اوتار جو پیدا ہونے کے فوراً بعد بولنے لگا) وہ اپنی ماں کو تسلی دیتا ہے اور اپنے والد "واسو دیو" کو سمجھاتا ہے کہ وہ اُسے کیسے بچائے۔ واسو دیو اپنے شیر خوار بچے کو ایک ناگ بادشاہ کی مدد سے دریا کی جانب لے جاتا ہے اور گوکل (گائیوں کا غول، ہندو، متھرا کا نواحی علاقہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کرشن جی یہاں پیدا ہوئے اور گائیں چرایا کرتے تھے) میں ایک ایسی لڑکی کے ساتھ تبدیل کر لیتا ہے جو کہ گڈریے "نندا" کے گھر میں تھوڑی دیر پہلے پیدا ہوتی ہے۔ بادشاہ کالنگر (کنس) لڑکی کو فوراً گرفتار کر لیتا ہے لیکن وہ اُوپر فضاء میں بلند ہو جاتی ہے اور بادشاہ کو یہ بتاتی ہے کہ کرشن کو بچایا لیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد اب کالنگر (کنس) کے تمام بچّوں کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن کرشن پھر بھی بچ نکلتا ہے۔ ایک راکھش عورت کو اس منصوبے کے تحت بھیجتا ہے کہ وہ کرشن کو اپنا زہریلا دودھ پلائے۔ کرشن اُس عورت کے پستان کو کاٹ لیتا ہے جس سے اُس عورت کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یکے بعد دیگرے کرشن مختلف راکھشوں کو مار دیتا ہے۔ کرشن جب جوان ہوتا ہے تو وہ گوکل کی عورتوں کا بہت پسندیدہ بن جاتا ہے۔ کرشن بانسری بجاتا ہے اور وہ عورتیں اُس کی بانسری سن کر مستانی ہو جاتی ہیں۔ کرشن ایک دیہاتی لڑکی "رادھا" کا عاشق بن جاتا ہے۔ کرشن نے آخر کار کالنگر (کنس) کے خلاف حملہ کیا اُس کو قتل کیا اور تخت و تاج پر قابض ہو گیا۔ اُس دور میں کرشن کی دوستی گوپیوں کی عورتوں سے ہو گئی۔ یہ گوپیاں وہ خواتین تھیں جو کہ چرواہوں کی بیویاں اور بیٹیاں ہوتی تھیں۔ اُن میں سے "رادھا رانی" سب سے مشہور گوپی تھی۔ ان گوپیوں سے کرشن کو بہت محبت تھی اور ہندو مت عقیدے کے مطابق اِن سے محبت خُدا سے محبت کی

علامت سمجھا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب میں ان گوپیوں کی بھی پُوجا کی جاتی ہے۔کرشن اپنی زندگی کے آخری دور میں مراقبے کے لئے ایک جنگل میں چلے گئے۔ایک دن کوئی شکاری شکار کے لئے وہاں آیا اُس کا تیر غلطی سے کرشن کو لگا اور وہ فوت ہو گئے۔

کرشن کی بانسری میں ایک سوز اور درد تھا۔اُس میں اُس کے فقیرانہ پن کی جھلک دیکھائی دیتی تھی۔جس کو منطق والطیر جدید میں زبردست تصوراتی انداز میں پیش کیا ہے۔

> "البتہ وہ ایک جس کا گھونسلا کرشن کی بانسری کے سوراخوں میں ہُوا کرتا تھا،بقیہ تین پرندوں سے سہا سہا اُن ڈار میں شامل ہو گیا تھا۔۔۔وہ اُسے شک کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ اُن کے نزدیک پرندگی کا سچ اُن کے پروں میں روپوش کر دیا گیا تھا۔۔۔اُن کے حلق دریائے نیل،دریائے اُردن اور مدینے کے جھرنوں سے تر ہوتے تھے۔۔۔کرشن پرندے کی پیاس صرف گنگا کے پانیوں سے بجھتی تھی"۔(۳۳)

ناول نگار مستنصر حسین تارڑ کرشن بھگوان کی ونجلی کے سوراخوں میں موجود پرندے کی کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ پرندہ دوسرے پرندوں کے گروہ میں شامل تو ہو گیا تھا لیکن وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھا کیونکہ اس گروہ میں موجود بقیہ تین پرندے احساس برتری کا شکار تھے۔اُنہیں یہ گمان تھا کہ جو سچّائی کا وصف اُنھیں حاصل تھا،کرشن پرندہ اُس سے محروم ہے اور جس حقیقت اور سچ کے وہ پاسدار ہیں ویسے کرشن پرندہ نہیں کیونکہ وہ دریائے نیل،دریائے اُردن،اور مدینے کے مقدس پانیوں سے اپنی پیاس کو سیر اب کر چکے تھے جبکہ یہ پرندہ صرف دریائے گنگا ہی کے پانی سے اپنی پیاس بجھاتا تھا۔اس پرندے کی پہچان صرف ہندوستان تک محدود تھی۔اگر ہم اس بات کا گہرائی میں جائزہ لیں تو مذہبی تعصب کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔جس کو مستنصر حسین تارڑ نے پرندوں کو بطور علامت استعمال کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔وہ مزید اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "میری راکھ کہاں پہنچی میں تو آج تک اندھیرے میں رہی۔۔۔بے شک طاہرہ کا مقام عشق مجھ سے بھی بہت بلند ہے۔۔۔وہ بہاءاللہ کے ساتھ اور میں کرشن کے ساتھ بیاہی گئی۔۔۔میں اُس کے کنول ایسے پاؤں کے ساتھ بندھ گئی اور وہ مجھے ڈولی میں ڈال کر لے گیا۔۔۔اور جب میں ایک سفید کفن میں لپٹی لکڑیوں کے ڈھیر میں

پڑی تھی تو بھی اُسی ڈولی میں سوار ایک دلہن تھی اور جب میں جل کر راکھ ہو گئی تو جلا تھا جسم جہاں وہاں دل تو نہ جلا۔۔۔ اور اُس دل میں ایک ڈولی اُتری تھی اُس میں سے ایک پکھیرو نے جنم لیا جو کرشن کے گیت گاتا چہکنے لگا۔۔۔ میں ایک پکھیرو جس کے رنگ نیارے اور چھیل چھبیلے تھے اپنے کرشن کی تلاش میں نکلی تو راستے میں چار پرندے ملے تھے اور سبھی اپنے اپنے سچّ کی تلاش میں اُڑانیں کرتے کسی قاف کے پہاڑ کی جانب چلے جاتے تھے۔ میں نے اُن کے ڈار میں شامل ہونا چاہا لیکن اُنہوں نے مجھے قبول نہ کیا۔۔۔ میرا رنگ روپ اور اُڑان کا ڈھنگ اُن سے جُدا تھا۔۔۔ اور جونہی ہم ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر اُترے۔۔۔ اُنہوں نے مجھے اجنبی جان کر چونچیں مار مار نڈھال کر دیا۔[۳۴]

تصوف کی دُنیا میں قراۃ العین طاہرہ کا مقام بلند درجے کا ہے۔ اُس کی شادی بہا اللہ سے ہوئی۔ کرشن کی شادی ودربھ کی راجکماری رکمنی سے ہوئی۔ کرشن کے دل میں بھی ایک ڈولی نے گھر بنا لیا تھا جس میں ہندومت پرندے نے جنم لیا جو کہ ہر وقت کرشن کے گیت گاتا۔ کرشن پرندہ ابھی شہرت کی بلندیوں کو نہیں چھو سکا۔ یہ ایک نیا پرندہ تھا۔ اس پرندے کی نسبت کرشن کی و نجلی سے وابستہ تھی۔ اس پرندے کی چال ڈھال، رنگ و روپ باقی سب پرندوں سے مختلف تھا۔ یہ پرندہ بھی جب سچائی کی تلاش میں نکلتا ہے تو اس کی ملاقات راستے میں عطارؒ کے پرندوں سے ہوتی ہے۔ وہ بھی حق اور سچائی کی تلاش میں کوہ قاف کی جانب جا رہے تھے۔ میں (کرشن پرندہ) نے اُن کے ساتھ ملنا چاہا، لیکن یہ کوشش رائیگاں گئی۔ عطارؒ کے پرندوں نے کرشن پرندے کے وجود کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ میرا وجود اُن کے لئے نیا تھا۔ چال ڈھال، رنگ و روپ سب کچھ اُن پرندوں سے الگ تھلگ تھا۔ اس کے باوجود میں نے اُن کے ساتھ اُڑان بھری اور ہم اُڑتے اُڑتے جوگیوں کی بستی ٹلہ جوگیاں پہنچ جاتے ہیں۔ عطارؒ کے پرندوں نے مجھے چونچیں مار مار کر زخمی کر دیا، میرا پورا جسم نڈھال ہو گیا۔ یہاں اس موڑ پر ناول نگار نے ایک تصوراتی انداز میں اور علامتی طور پر سامی مذاہب کے پرندوں سے ایک غیر سامی پرندے کی ملاقات اس خوبصورت انداز میں کرائی کہ نئے پرانے مذاہب کی تاریخ کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی اور اُن کو ایک مقام ٹلہ جوگیاں میں اکٹھا کیا۔ مزید اِن پرندوں کی گفتگو کا احوال لکھتے ہیں۔

"وہ ایسے پرندے تو نہ تھے تو اُنہوں نے ایسا کیوں کیا، اُن میں سے تین کا گٹھ جوڑ

تھا۔وہ تینوں ایک تسلسل میں آپس میں ایک ہی نسل ،یکساں تہذیب ملکوں، ثقافتوں اور کتابوں میں پروئے ہوئے تھے۔۔۔تم ہم میں سے نہیں ہو ۔۔۔ہم دریائے نیل، دریائے اُردن ، اور زمزم کے پانیوں کے پالے ہوئے ہیں اور تمھارے وجود میں سندھ اور گنگا جمنا کی لہریں ٹھاٹیں مارتی ہیں ۔۔۔بندرابن میں کُوکنے والے بت پرست، گھنٹیاں بجانے والے کافر پرندے ہو۔۔۔۔۔ایک مکھن چور کو محبوب ماننے والے پتھروں کو پُوجنے والے بے راہرو پرندے ہو۔۔۔ایک اجنبی پرندے ہو۔۔۔دفع ہو جاؤاور تب میں نے اپنے زخم چاٹتے ہوئے فریاد کی کہ۔۔۔اجنبی تو تم ہو کوہ طور، یروشلم، اور مدینے سے چلے آئے ہو۔۔۔ میں نے کہاں دفع ہونا ہے کہ میرا بیج تو اس دھرتی میں سے پھوٹا ہے۔ ۔۔۔میں کہاں جاؤں ۔۔۔تم تینوں کی شکلیں اُنیس بیس کے فرق سے ایک سی ہیں۔میری شکل تم جیسی نہیں ہو سکتی تو تم جاؤ"۔(۳۵)

ہندو مذہب کے کرشن پرندے کو اس بات پر تعجب ہوا کہ اِن وسیع النظر پرندوں نے جو کہ اپنے آپ کو بہت ابتداء کا بتاتے ہیں، اُن پرندوں نے اُس پر تشدد کیوں کیا؟ اِن چار پرندوں میں سے تین پرندوں کا ازل سے سفر جاری تھا۔وہ مسلسل ایک جیسی تہذیب وثقافت ایک ہی جیسی نسل میں چلتے آرہے تھے۔ان تینوں پرندوں کی مذہبی تعلیمات ایک جیسی تھی صرف نام کے مختلف تھے۔اُن میں سے ایک کوہ طور کا پرندہ تھا، ایک یروشلم کا پرندہ تھااور ایک غار حرا کا پرندہ تھا۔یہ تینوں بین الاقوامی شہرت کے پرندے تھے۔اُن کا وجود اس کائنات میں بہت پہلے سے چلا آرہا تھا۔پُوری دُنیا میں ان پرندوں کے ماننے والے چلے آرہے تھے۔ان پرندوں کے لئے کرشن پرندے کا وجود بالکل نیا تھا۔اس لئے اُنہوں نے کرشن پرندے کو واضح طور پر کہا کہ تمہارا وجود ہم میں سے نہیں، ہم تم کو نہیں جانتے۔ہم بلند رُتبے کے مالک ہیں، ہم ازل سے چلے آرہے ہیں، ہم نے دریائے نیل، دریائے اُردن اور زمزم کے پانیوں میں پلے ہوئے ہیں جبکہ تمھارا وجود اور پہچان صرف یہی علاقہ ہے۔تم نے گنگا جمنا اور دریائے سندھ کا پانی پیا ہوا ہے۔تمہاری دُنیا میں کوئی پہچان نہیں اور اگر ہے بھی تو صرف اپنے خطے اور علاقے میں ہے۔تم بتوں کی پُوجا کرنے والے، مندروں کی گھنٹیاں بجانے والے، ایک مکھن چور کرشن کو ماننے والے ایک بالکل اجنبی پکھیرو ہُو۔تمام کی باتیں سننے کے بعد کرشن پرندے نے اپنے زخم کو مرہم لگاتے ہوئے عاجزانہ التجا کی، کہ اس دیار میں میرا کوئی نیا وجود نہیں ہے۔میں ایک حقیقت

ہوں اور صدیوں سے اس دھرتی کے ساتھ وابستہ ہوں۔ہاں البتہ اگر اس دھرتی پر اگر وجود نیا ہے تو وہ تمہارا ہے۔میں نے تو اس سرزمین میں جنم لیا ہے۔یہ سرزمین تو کرشن کا گھر ہے۔میں کدھر جاؤں اسلئے تم کو جانا ہو گا۔

"میرے بال و پر نوچے گئے۔ڈھونگیں مار مار کر اُنہوں نے میری کو ملتا کو لہولہان کر دیا اور میں ٹلہ جوگیاں سے اُترا اور اس جھاڑی میں اپنا لہو چاٹنے اور اپنے نوچے ہوئے بال و پر کے دوبارہ اُگنے کے انتظار میں پناہ گزین ہو گیا۔۔۔مجھے اُن سے ایک گلہ بہت ہے۔۔۔وہ سب سے پہلے جنم لینے والے بُدھ پرندے کو کچھ نہیں کہتے،اُسے محض اس لیے قبول کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک اگر اس دھرتی پر ایک لاکھ بیس ہزار اوتار آئے اور دُنیا کی ہر بستی میں اُنہی کی زبان بولتے آئے تو وہ فاقہ کش بُدھ بھی اُن میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ اُسے اوتار مانتے ہیں اور میرے کرشن سے انکاری ہوتے ہیں۔اُس کی تضحیک کرتے ہیں کہ وہ تو ایک مکھن چور لونڈا تھا۔۔۔گوپیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتا رہتا تھا۔ میں کیوں جواب دوں کہ گوپیاں تو اوروں کی بھی تھیں"۔ (۳۶)

ان تینوں الہامی پرندوں نے کرشن پرندے کی نرم دلی اور سخاوت کو کچل دیا اور یوگیوں کی دھرتی ٹلہ جوگیاں سے واپس جب وہ اپنے مسکن میں آیا اور دوبارہ اپنے آپ کو سنبھالنے لگا لیکن کرشن پرندے نے اُن سے یہ شکایت کی کہ اُنہوں نے بُدھ پرندے کے صوفی کو کچھ نہیں کہا۔اُس کو تُو اپنے ڈار میں دیکھ کر اور اپنے ساتھ اُڑتا دیکھ کر اُن کو تعجب نہیں ہوا۔ گوتم بُدھ کی ہستی کو من و عن تسلیم کیا۔اس حوالے سے شاید اُن کے ذہن میں یہ بات ہو کہ دُنیا میں ایک لاکھ بیس ہزار انبیاؑ آئے جو کہ خُدا کی طرف سے اُتارے گئے،جو کہ ہر خطے میں اللہ کی تعلیمات کو لے کر گئے۔ گوتم بُدھ نے راہ سلوک کی راہ کو اختیار کیا تھا سچائی کی تلاش میں چلے کاٹے اور بھوک برداشت کی،اللہ کی کھوج میں جنگلوں میں سکونت اختیار کی اور نروان (نجات) حاصل کی،یہی وجہ ہے کہ وہ اُس کو اپنے جیسا مانتے ہیں۔ کرشن جس نے مراقبے کے لئے جنگل کا رُخ کیا۔اُس کو کسی صورت تسلیم نہیں کرتے۔اُس کو ہتک آمیز طریقے سے دیکھتے ہیں کہ اُس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اُس کا کام تُو سوائے چراہوں کی بیویوں اور بیٹیوں کو ونجلی (بانسری) سنانا تھا اور اُن کو لطف اندوز کرنا تھا۔حالانکہ یہی کام ہیر کے لئے رانجھے نے بھی تو کیا تھا۔اُس پر کوئی بات نہیں کرتا۔

"اپنی چونچ کو بند رکھو۔ مُوسٰے نے اُسے ڈانٹا اور پھر اُس کے زخموں پر بلھے شاہ کی مرہم کا پوچا پھیرا، شاہ حسین ،بابا فرید، اور سچل سرمست کے سرمدی پھاہے رکھے۔رومی کے جذب کے جزیرے اُس کے نوچے گئے بال وپر میں جذب کیے۔ میاں محمد کی شام کے دُھندلکوں کے پانیوں سے اُس کے زخم دھوئے"(۳۷)

ایسی صورت حال میں میں ناول کے مرکزی کردار مُوسٰے حسین نے کرشن پرندے کی داد رسی کی، اُس کے دُکھ کا مدوا کیا۔ کرشن پرندے کو صوفیاء کی تعلیمات کے بارے میں بتایا کہ صوفی کسی بھی مذہب کو ہو، اُس نے ہمیشہ پیار محبت اور امن آشتی کی بات کی ہے۔ ہمیشہ شفقت کا درس دیا ہے۔ اِن صوفیاء نے کسی صورت مذہب کی تفریق نہیں آنے دی۔ ہر مذہب کے لوگوں کو گلے لگایا ہے۔ ان صوفیاء نے انسانیت کو اپنا شعار بنایا ہے۔ مولانا روم ہو، بابا بلھے شاہ ہو، شاہ حسین ہو یا پھر میاں محمد بخش سب نے انسانیت سے محبت کی ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے مذہب کے اندر صوفیاء اور جوگی گزرے ہیں اُنہوں نے بھی معرفت کا مقام بہت ریاضت اور محنت سے حاصل کیا ہے۔ اُن کی بھی انسانیت کے ساتھ محبت والہانہ تھی۔ مُوسٰے حسین کی ان باتوں سے کرشن پرندے کا حوصلہ بڑھا اور اُس کو تسلی ہوئی۔

"اُس کرشن پرندے کے سب کے سب زخم بھر گئے، خراشیں مندمل ہو گئیں اور اُن مرہموں اور پھاہوں کی تاثیر سے اُس کے نوچے گئے بال و پر پھر سے ہرے بھرے ہو گئے اور وہ شادمانی سے چہکنے لگا۔۔۔ اُس رومی کے شمس کی دھوپ کرنیں میرے لیے ایک نئی زندگی کا پیام لے کر آ گئیں اور یہ جو شاہ حسین ، بابا فریدؒ، سچل سرمست، میاں محمد اور بلھے شاہ تمہارے اور ہمارے ہیں۔ یہ اس دھرتی کے جوہڑوں میں کھلنے والے ایسے کنول ہیں جن میں ہر کنول ہر ایک بُدھ گیان میں براجمان ہے۔ یہ سب تو کرشن کا ہی ایک روپ ہیں، تو میں اب اُن کے گیت بھی گاؤں گا"۔(۳۸)

کرشن پرندے کو تسلی ہوئی اور اُس کے شکوے شکایت کا ازالہ ہوا تو اُس کا من صاف ہو گیا۔ وہ پھر سے تازہ دم ہو گیا۔ اُس کے بال وپر دوبارہ سلامت ہوئے تو اُس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔ اُس کرشن پرندے کے لئے مولانا روم کی تعلیمات ایک نیا پیغام لے کر آئی۔ اُس پر یہ واضح ہوا کے یہ تمام صوفیاء جن میں شاہ حسینؒ، بابا فریدؒ سچل سرمست، میاں محمد اور بلھے شاہ ہیں یہ اس دھرتی کے ایسے پھول ہیں اور ایسے کرشمے ہیں

کہ ان تمام کی تعلیمات اور فیض وہی کچھ ہے جو کہ کرشن کی تعلیمات میں تھا۔یہی وہ امن وآشتی کا پیغام کرشن کا تھا۔سب صوفیاء نے سچائی کی تلاش میں مختلف چلّے کاٹے اور ریاضتیں کیں جیسے کہ کرشن مہاراج نے کیا۔اب ہم سب ایک ہیں۔اب میں ان تمام کے گُن گاؤں گا۔ان تمام صوفیاء کی منزل ایک تھی۔یہ وہ عظیم ہستیاں تھیں کہ جن کے دروازے ہر مذہب کے لوگوں کے لئے کھولے تھے۔انہوں نے انسانیت کو اخلاقیات کا ایسے ہی درس دیا کہ جیسے کرشن نے دیا تھا۔

"تم نے اے کرشن پرندے کہیں نہیں جانا۔۔۔ ہم سے بھول ہوئی کہ ہم نے تمہاری کو ملتا کی کنوارگی کو اپنی چونچوں سے ادھیڑ ڈالا۔۔۔ ہمیں احساس ہو گیا کہ تمہارے بغیر ہم ادھورے ہیں ۔جب تک تم ہماری ڈار میں شامل نہیں ہو جاتے ہم نامکمل ہیں ۔۔۔ تمہارے اور اب ہمارے بھی کرشن کے بغیر سچ ادھورا ہے۔اگر تم واپسی کا قصد کرو گے تو ہم تمہارے ہمراہ اُڑان کرتے بندرابن میں جا بسرام کریں گے۔۔۔ ہم جان گئے ہیں کہ سچ صرف قاف اور جوگی پہاڑ کی چوٹی پر ہی نہیں ۔بندرابن میں بھی اس کی کچھ چنگاریاں سلگتی ہیں ۔۔۔ نہ جاؤ"۔(۳۹)

کرشن پرندے کی پہچان کا آشکار ہوا تو باقی مذاہب کے پرندوں کو بھی اس بات کی آشنائی ہوئی تو اُنہوں نے بھی اُنسیت، ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا اور کہا کہ اے کرشن ہم تمہارے بغیر نامکمل اور ادھورے ہیں۔تم نے بھی حقیقت اور سچائی کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔اس کام کے لئے تم نے بھی راہ سیر وسلوک اور تصوف کی راہ کو اپنایا تھا،اب تمہارے بغیر سچ مکمل نہیں ہوتا کیونکہ تم تصوف اور صوفی ازم کی راویت کا حصہ ہو۔اگر تم نے واپسی کا ارادہ کیا اور ٹلہ جوگیاں کے اس مرکزی ڈار سے نکلنے کی کوشش کی تو ہم سب تمہارے ہمراہ اُڑان بھریں گے ۔ہم تمہارے ساتھ کرشن کی بستی بندرابن میں جائیں گے۔(بندرابن ہندوستان کے صوبہ اُترپردیش کا ایک شہر ہے جس کو مندروں کی دھرتی کہتے ہیں۔اس شہر میں ایک ہزار مندر ہیں ہم یہ حقیقت جان چُکے ہیں کہ سچ صرف کوہ قاف اور ٹلہ جوگیاں کی پہاڑیوں پر ہی نہیں ہے بلکہ اس کی جھلک اس کی روشنی کرشن کے شہر بندرابن میں بھی نظر آتی ہے۔ہم سب ایک ہی منزل کے راہی ہیں اور وہ منزل تصوف اور صوفیاء والی منزل ہے

(ج) سکھ مت مذہب کے حوالے سے

سکھ مت مذہب کا شمار توحیدی مذہب میں ہوتا ہے۔اس مذہب کے پیروکاروں کو سکھ کہا جاتا ہے۔ سکھ مت مذہب کے بنیادی طور پر دس گوروٴہیں کہ جنہوں نے اڑھائی سو سال تک سکھ مت مذہب کے رہنما اصول و قوائد مرتب کیے۔بابا گورونانک سکھ مذہب کے بانی ہیں اور پہلے گورو بھی ہیں۔ گورو نانک کے والدِ محترم خود ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔نانک کے والد ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے ایک مقام تلونڈی ہے جو کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے اُس کا مالیہ اکٹھا کرنے پر مامور تھے جو کہ اُس وقت بادشاہ کی طرف سے عام طور پر ڈیوٹی لگائی جاتی تھی۔ سکھ مذہب ایک غیر سامی مذہب ہے۔ سکھوں کی عبادت گاہ کو گوردوارہ کہا جاتا ہے۔ان کی مذہبی کُتب میں "شری آدی گرنتھ" یا "گیاں گرو گرنتھ صاحب" شامل ہیں۔ سکھوں کی بنیادی طور پر عبادت اور روحانیت کا اہم مرکز گرونانک کا کلام ہے۔ سکھ مذہب کا شمار دُنیا کے بڑے مذاہب میں نہیں ہوتا البتہ اس مذہب کا آغاز ہندومت سے ہوتا ہے۔ یہ ہندومت سے نکلنے والی ایک نئی شاخ ہے۔اس کا وجود ہندومت سے سکھ مت کی طرف آیا اور اس مذہب کا پندرہویں صدی کے آخر میں ہوا، لیکن ابھی تک بھی اس کو جدید مذاہب کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے میں یہ کوئی الگ مذہب نہیں اُن کا یہ نظریہ ہے کہ سکھ مذہب اُن معیارات پر پورا نہیں اُترتا جو کہ ایک مذہب کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔اس مذہب میں نہ کوئی عقائد کی وضاحت کی گئی ہے اور نہ ہی کوئی مذہبی معاملات کو واضح کیا گیا ہے۔ان دو بنیادی وجوہات کی بنیاد پر کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سکھ مت باقاعدہ مذہب نہیں بلکہ یہ ہندومت مذہب کی ہی الگ ایک ذیلی شاخ ہے۔ یہ مذہب ہندوستان میں بھی ابتداء ہی سے اقلیت کا شکار رہا ہے۔ سکھ مذہب میں پانچ "ککے" شامل ہیں جن کو "ککار" بھی کہا جاتا ہے۔

ا۔ کیس۔ اس سے مراد سر کے بال، داڑھی اور مونچھیں ہیں۔

۲۔ کرپان۔ ایک خنجر ہوتا ہے جو سکھ اپنے دفاع کے لیے اپنے پاس رکھتے ہیں۔اِس سے وہ اپنی حفاظت کا کام لیتے ہیں۔

۳۔ کچھا۔ یہ سکھوں کی مذہبی علامت کے طور پر پہنا جاتا ہے۔اس کو جانگھیا بھی کہتے ہیں۔ یہ چستی کے لیے زیب تن کیا جاتا ہے۔

۴۔ کنگھا۔ یہ بھی سکھوں کی مذہبی علامت ہے جو کہ سر کے بالوں کو صاف اور ہموار کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

۵۔ کڑا۔ یہ ہاتھ میں پہنا جاتا ہے۔ کڑا مذہبی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اسٹیل کی دھات وغیرہ کا بنا ہوتا ہے۔

واحدانیت

سکھوں کے روحانی پیشوا بابا نانک بڑی ہی جامعیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں وضاحت کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ وہ اللہ ایک ہے، وہ اکیلا ہے۔ اس حوالے سے وہ فرماتے ہیں۔

> " اللہ واحد ہے، ہمیشہ رہنے والی صداقت ہے، وہ خالق کائنات ہے، وہ خوف اور دشمنی سے سے بالاتر ہے، بقا ہی بقا ہے، اُسے کسی نے نہ جنا ہے اور نہ وہ جنا گیا ہے۔ لافانی ہے، اُسی کا ذکر کرو، وہ ازل سے حق ہے اور وہ ہر دور میں اور وقت میں حق ہے، وہ ہر جگہ اور ہر وقت حق ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے حق رہے گا"۔[۴۰]

گرونانک خُدا تعالیٰ کی واحدنیت پر کامل یقین رکھنے والے تھے۔ اس کے علاوہ گرونانک اسلامی تعلیمات و عبادات، نماز، روزہ، کلمہ اذان کی اہمیت وغیرہ سے سے بخوبی واقف تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر کامل یقین رکھتے تھے۔ اُن کی اسلام سے بھی والہانہ عقیدت اور محبت تھی۔ گرونانک بُت پرستی سے نفرت کرتے تھے۔ اُن کی اسلام دوستی اور محبت بہت واضح اور جامع تھی۔

> "سکھ حضرات یہ تسلیم کرتے ہیں کہ گرونانک حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ بھی گئے تھے، بعد ازاں بغداد شریف حضرت غوث الاعظم سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی بارگاہ میں بھی حاضری دی۔ بغداد شریف سے آپ کو چغہ (چولہ) ملا تھا۔ جس پر کلمہ طیبہ، قرآنی آیات، سورہ فاتحہ، سورہ اخلاص، سورہ نصر، آیت الکرسی اور اسماء الحسنیٰ درج ہیں۔ یہ چولہ ڈیرہ بابا نانک ضلع گورداسپور میں آج بھی موجود ہے"[۴۱]

گرونانک کی اسلام سے محبت و شفقت مثالی تھی۔ اُن کے ڈیرے پر تمام مذاہب کے لوگوں کا ہجوم

رہتا تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب خالق حقیقی کی مرضی اور حکم سے ہو رہا ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ اپنے روحانی تجربات کی بنیاد پر عقیدت و محبت سے ایک خُدا کی عبادت کی بات کی ہے اور لوگوں کو یہ درس دیا ہے کہ عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات ہی ہے۔

سکھ مت مذہب کے بنیادی عناصر

سکھ مت مذہب کے ماننے والے لوگ ایک خُدا کی عبادت کرتے ہیں۔ سکھ مذہب ایک ایسا مذہب ہے کہ جس میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو فوراً سکھ نہیں بنادیا جاتا بلکہ پختہ عمر میں پہنچ جانے کے بعد اُس کو سکھوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اِس رسم کے لئے میٹھے پانی کے پیالے میں کرپان پھیری جاتی ہے اور نئے سکھ بننے والے شخص کو عقیدے کی سچائی اور ممنوعات کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اِس عمل کے بعد اُس پر پانی کے چھینٹے مارے جاتے ہیں۔ اُس کے بعد وہ فرد باقاعدہ طور پر سکھ مذہب میں شامل ہو جاتا ہے

گرونانک کا جو مرکزی روحانی تجربہ سلطان پور میں ہُوا تھا اُس کا سب سے پہلا شعری اظہار مول منتر (بنیادی کلمہ) کی صورت میں ہُوا۔ مول منتر (بنیادی کلمہ) کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب میں ذاتِ باری تعالی کا تصوّر نہایت جامع شکل میں بیان ہوا ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرونانک کا عقیدہ توحید اسلامی نظریہ توحید سے مختلف نہیں تھا۔ گرونانک تقدیر الٰہی اور صوفیانہ اصطلاح میں اندرونی اعتبار سے موافقت پر زور دیا ہے۔ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ اِس لئے انسان اپنی ذاتی مرضی اور دُنیاوی خواہشات کو ختم کر کے راضی بر ضا رہتے ہوئے خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ اِس کے علاوہ گرونانک نے انانیت کے ساتھ ساتھ دوسری نفسانی خرابیوں مثلاً خواہشات لالچ، دُنیا سے تعلق (موہ) غصہ (کرودھ) وغیرہ کو بھی اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔ بنیادی طور سکھ مت کا جو طریقہ ہے وہ نام سِمرن یا ذکر الٰہی ہے۔ نام سمرن کا ایک عام طریقہ ہر وقت اللہ کا نام لیتے رہنا کے ہے جو کہ دین دار سکھ دہراتے رہتے ہیں۔ جب وہ اپنے مشاغل میں مصروف عمل ہوتے ہیں۔ اِس میں خصوصی صورت صبح نہار منہ جاگ کر گرنتھ صاحب میں سے منتخب کلام کو پڑھتے ہیں اور یکسو ہو کر کچھ دیر یادِ الٰہی میں غرق رہنے کے ہیں۔ بعض سکھ نام سمرن کے لئے چھوٹی تسبیح کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ نام سِمرن کے علاوہ جو چیز سکھ مت کے نزدیک عشق الٰہی کے حصول میں معاون ہوتی ہے اُن میں سادھ سنگت (نیک صحبت) سیوا (خدمت خلق)، ایمانداری سے روزی کمانا اور دوسروں کو اِس میں شریک کرنا، انکساری اور اللہ کی مخلوق سے محبت اور ہمدردی جیسی صفات شامل ہیں۔ سکھ مت مذہب میں رہبانیت کی

کوئی گنجائش نہیں۔ سکھ مت مذہب میں عبادات کے لئے کوئی خاص دن مختص نہیں ہے۔ سکھوں کی عبادت گاہ گردوارہ، رنگ، تخلیق کی تفریق کے بغیر تمام لوگوں سے کُھلا رہتا ہے۔ سکھ مت مذہب میں چار احکامات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

1۔ بالوں کاٹنے کا ارادہ نہ کرنا

2۔ جسم کو تمبا کو یا کوئی اور زہریلا چیز کے ساتھ نقصان نہ پہنچانا۔

3۔ قربانی کا گوشت تناول نہ کرو

4۔ زنانہ نہ کرو۔

سکھ مت مذہب میں سماجی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعاون سکھ مت مذہب کا اہم اصول ہے۔ جس میں ایک دوسرے کی خدمت کی جاتی ہے اور کھانا وغیرہ پکایا جاتا ہے۔

گرونانک پیدائش۔

گرونانک کی پیدائش ۱۵ اپریل ۱۴۶۹ء کو شہر ننکانہ (پرانا نام تلونڈی) میں ہوئی۔ اُن کا یوم پیدائش گرونانک گرپورب کے طور پر ماہ کاتک (اکتوبر، نومبر) میں منایا جاتا ہے۔

لڑکپن

گرونانک بچپن سے ہی بہت سنجیدہ مزاج کے مالک تھے۔ وہ ابتداء میں ہی اپنے ساتھیوں اور اپنے ہم عمر لڑکوں سے شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اُن میں خاص بات یہ تھی جو کہ اُن کو دوسرے لوگوں سے ممتاز اور الگ کرتی ہے۔ آپ بچپن میں کبھی کبھار کھیلتے خود میں محو ہو جاتے تھے۔

ابتدائی تعلیم

گرونانک جب سات سال کے ہوئے تو زمانے کی روایت کے مطابق آپ کے والد کلیان چندر عرف کالو نے ایک برہمن سے رسمی شگون لے کر گوپال نامی اُستاد کی پاس تعلیم کے لئے بھیج دیا اور اُستاد کو زمانے کی رسم ورواج کے مطابق چاول، شکر، اور چاندی کے سکے بطور ہدیہ پیش کیے۔

> "اُستاد گوپال نے نانک کو حروف ابجد تختی پر لکھ کر دیے تا کہ وہ اُنہیں زبانی یاد کرلے۔ لیکن وہ پہلے ہی روز نانک اُستاد کے پاس سے بہت سنجیدہ واپس آئے۔ آپ کی بہن نانکی جسے اپنے بھائی سے بہت زیادہ محبت تھی نانک کو سنجیدہ

دیکھ کر پریشان ہوگئی ۔لیکن نانک نے بہن سے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔نانک اگرچہ اُستاد سے ابجد اور ہندسوں کو سیکھتا رہا۔لیکن ہر روز اُس کی سنجیدگی میں اضافہ ہوتا گیا"۔(۴۲)

گورونانک کی بہن "بی بی نانکی" اُن سے پانچ سال بڑی تھی۔جب بی بی نانکی کی شادی ۱۴۷۵ میں ہوئی تو وہ سلطان پور منتقل ہو گئیں۔ گورونانک کو اپنی بہن سے محبت اور لگاؤ تھا اور وہ اسی محبت کی پاداش میں اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ سلطان پور رہائش پذیر ہوئے۔ گرونانک نے ابتدائی عمر میں ہی سنسکرت اور ہندو مذہب کی جو مقدس کتابیں ہیں اُن تمام کُتب کا مطالعہ کر لیا تھا۔اُس کے علاوہ گرونانک نے اُس وقت کے دستور حیات کے مطابق مسجد کے مکتب میں عربی زبان کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔بہت قلیل وقت میں آپ نے تینوں زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔

متصوفانہ واقعات

گرونانک کی بہن "بی بی نانکی" اور مقامی زمیندار "رائے بلار" اُن شخصیات میں شامل تھے کہ جنہوں نے کم عمری میں گرونانک کی خصوصیات کو پرکھ لیا تھا۔ایک روایت کے مطابق ۱۴۹۹ میں جب گرونانک ۳۰ سال کے تھے تو وہ غسل کر کے واپس نہ لوٹے اور اُن کے کپڑے "کالی بین" نامی مقامی چشمے کے پاس سے ملے تھے۔ قصبے کے لوگوں کو یہ خیال آیا کہ شاید دریا میں ڈوب گئے ہیں۔دولت خان نے اپنے سپاہیوں کی مدد سے دریا سارے کا سارا چھان مارا لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔اپنی گم شدگی کے تین دن بعد گرونانک دوبارہ نظر آئے اور اس معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کی۔

اسی طرح ایک دفعہ گورونانک گاؤں کے قریب مویشی چرا رہے تھے سہ پہر کا وقت تھا نانک جیسے ہی ایک درخت کے نیچے لیٹے تو اُنہیں اونگھ آگئی اور وہ سو گئے۔رائے بلار نامی شخص کھیتوں کی دیکھ بھال کے بعد واپس گھر آرہا تھا کہ اُس کی نظر درخت کے نیچے گرونانک پر پڑی۔اُس کا گھوڑا روک گیا اُس نے کیا دیکھا کہ تمام درختوں کے سائے سورج کے ساتھ ساتھ اپنا سایہ بدل چکے تھے۔جس درخت کے نیچے نانک صاحب تھے اُس کا سایہ وہی پر کھڑا تھا۔رائے بلار نے جب یہ سارا منظر دیکھا تو گھوڑے سے اُتر کر نانک جی کو گلے لگایا اور اُس کے ماتھے کو چوما اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ نانک پر اللہ تعالیٰ کا خاص سایہ ہے۔اللہ کی شان دیکھو کہ اُس نے اپنے اس خاص بندے کے لئے کیسے درخت کا سایہ قائم دائم رکھا۔یہ درخت اب بھی ننکانہ صاحب کے گوردوارے کے پاس موجود ہے۔

ہندوؤں کے مقدس مقامات کی زیارت

گورونانک سفر کرتے ہوئے پانی پت سے سرہند گئے اور پھر گنگا جمنا کے سنگم پر ہندوؤں کے مشہور مقدس جگہ " یاگ" پر پہنچے۔ وہاں پر لوگ اشنان کر رہے تھے تو گرونانک نے اُن سب کو اپنی طرف مخاطب کیا اور اُن سے کہا کہ تم سب کیا کر رہے ہو؟ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اپنے گناہ دھو رہے ہیں۔ نانک صاحب نے جواب دیا کہ اگر تم اپنے گناہ دھونا چاہتے ہو تو اپنے دل کو دھوؤ، اُس کو صاف کرو۔ اُن لوگوں کے دل صاف آئینے کی مانند ہوتے ہیں جن کے دل میں رب ہوتا ہے۔ اس واقعے کے بعد گرونانک ہندوؤں کا جو علم و گیان کا مرکز تھا وہاں گئے۔ وہاں پر براہمن، وید، اور شاستر پڑھ کر سنا رہے تھے۔ ہندوؤں کے بڑے پنڈت چتر داس نے نانک سے پُوچھا کہ آپ کون ہے؟ اور ایسا صوفیانہ لباس کیوں زیب تن کیا ہوا ہے؟ گرونانک نے جواب دیا۔ "اگر مالا پہننی ہے تو رب کے نام کی مالا پہنو اور اگر زندگی کی کھیتی سیراب کرنی ہے تو تمہیں اپنی زندگی کا مالی بننا پڑے گا۔"(۴۳)

نانک صاحب کی باتوں سے تصوف کی فکر ظاہر ہوتی تھی۔ جس وقت آپ نے یہ الفاظ ہندو پنڈت کو کہے تو وہ سکتے کے عالم میں آ گئے اور ششدر رہ گئے اور یُوں نانک جی وہاں سے آگے کی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک دفعہ بُدھ مت مذہب کے علماء نے گورونانک کو گھیر لیا اور اُن سے پُوچھا کہ آپ کون ہیں۔ نانک نے بہت ہی صوفیانہ انداز میں جواب دیا کہ میں خُدا کا عام سا بندہ ہوں اور وہ ایسی بابرکت ذات ہے کہ جس کا نام لینے سے دل کو سکون اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

وفات

گورونانک کی وفات ۱۵۳۹ء میں کرتارپور میں ہوئی۔ وفات پر تینوں مذاہب کے لوگوں کی آپس میں اس بات پر لڑائی ہوئی کہ ہندو کہتے تھے کہ نانک ہمارے مذاہب کے ہیں۔ ان کی تدفین ہندو مذہب کے مطابق ہو گی جبکہ مسلمان کہتے تھے کہ نہیں وہ مسلمان تھے۔ لہذا ہم اُن کو اپنے مذہب کے دفن کرے گے۔ اسی طرح سکھوں کا مطالبہ بھی یہی تھا۔

تعلیمات

نانک کا تعلق ہندو گھرانے سے تھا لیکن اُن کی تعلیمات ہندو مذہب کے خلاف تھی۔ آپ ہندوؤں کے رہن سہن، رسم ورواج، اور بتوں کی پُوجا کے سخت مخالف تھے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ پر دُرست ہے کہ

گرونانک نے ایک خُدا کو یاد کرنے کے لئے مختلف نام استعمال کیے ہیں۔ان ناموں میں سے کچھ نام ہندوستانی روایت سے ماخوذ ہیں۔مثال کے طور پر ہری، گوبند، موہن، اکم، کرنہار اور کچھ نام مسلم روایات سے جوڑے ہوئے ہیں جیسے کہ خُدا، اللہ، کریم، رحیم ،اور ربّ وغیرہ۔بہر صورت ان تمام سے مراد ایک ذات واحد ہے۔گورونانک کی تمام مذہبی شاعری خُدا کے تصّور اور انسان کے فرائض کے بارے میں ہے۔گورونانک نے ترک دُنیا کے لئے لباس فقر پہننے کا پختہ ارادہ کیا تو تمام قیمتی لباس، ملبوسات، وغیرہ کو اُتار پھینکا۔ایک صوفی کے لباس میں ہر جگہ گھومتے رہے لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کہ نانک ہندو مذہب سے وابستہ ہیں کہ وہ کوئی مسلمان قلندر ہیں۔

> "عمر کے آخری دور میں جب اُن کی شہرت بحیثیت ایک بزرگ شخصیت کے دور دور تک پہنچ چکی تھی، کرتارپور میں اُن کا ڈیرا ایک روحانی مرکز کی حیثیت اختیار کرتا جارہا تھا۔دور نزدیک سے اُن کے معتقدین کرتارپور میں اُن کی زیارت اور روحانی تعلیمات سے فیض یاب ہونے کے لئے کھنچے چلے آتے تھے۔روزانہ صبح اور شام کو "کیرتن " (سماع معہ مز امیر) کی محفل ہوتی تھی۔جس میں گورونانک صاحب کا کلام پڑھ کر سنایا جاتا تھا"۔(۴۴)

گورونانک نے اپنے عشق کے مسلک کو مد نظر رکھتے ہوئے شریعت کی باقاعدہ پابندی کی اور ظاہری اطاعت کے مقابلے میں تقدیر الٰہی پر راضی ہونے پر زور دیا۔نانک اس بات پر کامل یقین رکھتے تھے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔سکھ مت کی تعلیمات کو آگے فروغ دینے کے لئے گورونانک نے اپنے جانشین مقرر کیے۔سکھ مت میں دس گورو بہت مشہور ہیں۔جن کا انتخاب خاندان یا حسب و نسب دیکھ کر نہیں کیا گیا بلکہ اُن کی فیاضی، سخاوت، اور جان نثاری کے جذبے کو دیکھ کر تقرر کیا جاتا تھا۔سکھ مت کے دس گوروں کو گورو نانک نے اپنے ہی جسم کا حصّہ قرار دیا ہے۔ان گوروں میں گرو انگد اجی، گورو امر داس، گورو رام داس جی، گورو ارجن سنگھ، گورو ہر گوبند، گورو ہر رائے سنگھ، گورو سری ہر کرشن، گورو تیغ بہادر صاحب، گورو گوبند سنگھ شامل ہیں۔

> "سکھ عقیدہ کے مطابق گرو نانک صاحب نے اُس "نور" کو جو اُن کے اندر جلوہ گر تھا انگدا کے اندر منتقل کر دیا اور اُس کو گرو کے مقام پر بیٹھا کر خود مرید کی حیثیت سے نذارانہ پیش کیا".(۴۵)

بابانانک نے مذہب کے اندر خاندانی اُجارہ داری اور گدی نشینی کی روایت کو ختم کیا۔ اُن کے ڈیرے پر چھوٹے بڑے، امیر، غریب سب کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ گورونانک نے طول و عرض میں سفر کیا اور لوگوں میں اپنی تعلیمات کا پرچار کیا۔ مشرقی ہندوستان کی طرف اڑیسہ، آسام، بنگال، اور راجستھان کا سفر کیا، پھر جنوب کی جانب گئے اور سری لنکا تک اپنی تعلیمات کو فروغ دیا۔ برصغیر پاک وہند کے علاوہ بھی مدینہ شریف، مکہ ، مصر، تاشقند، اُردن ،شام ،اسرائیل کا سفر کیا۔ نانک کا نظریہ خُدا بہت آفاقی اور لا محدود تھا۔ بغداد شریف گئے تو وہاں پر مسلمان علماء کے سامنے ایک فارسی کی نظم پڑھی جس میں اُنہوں نے کہا کہ تم لوگ کیوں زمینوں اور آسمانوں کی تعداد کو گنتے ہو؟ کائنات تو ایک نہ ختم ہونے والی اور لا محدود چیز ہے۔

سکھ مت میں تصوف

تصوف کی روایت ہر مذہب میں چلتی آرہی ہے۔ اسی طرح سکھ مت میں بھی اس کی روایت باقی سامی و غیر سامی مذاہب کی طرح موجود ہے۔ خود بابانانک جو کہ سکھ مذہب کے بانی ہیں اُن کا تذکرہ بھی اُن صوفیاء میں کیا جاتا ہے جنہوں نے ربّ کی تلاش میں، حق اور سچ کی تلاش میں اپنا گھر بار، سہولیات، سکون کی نیند کو چھوڑ کر عالمِ تنہائی میں چلے گئے۔ جنگلوں میں جا بسیرا کیا، ویرانوں کو اپنا مسکن بنایا، مختلف ریاضتیں کی، چلّے کاٹے، مراقبے کیے اور تب جا کر منزل مقصود حاصل ہوئی۔ سکھوں کے گوروؤں کی جو مذہبی تعلیمات ہیں اُن میں تصوف کی آمیزش واضح انداز میں نظر آتی ہے۔ سکھ مت کے گرو فقراء کا لباس پہنتے تھے اور اپنی وضع سے ایسے نظر آتے تھے کہ جیسے کوئی صوفی ہو۔ خود سکھ گرو بھی اپنا یہ تعلق ظاہر کرتے تھے کہ ہم لوگ مسلمان فقراء کے ہمنوا ہیں۔ ہماری بھی اُن کے ساتھ ظاہری و باطنی کوئی نہ کوئی نسبت ہے۔ بابانانک کو صوفیاء سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اُنہوں نے اس سلسلے میں کافی علاقوں کا سفر کیا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار پر تشریف لے کر گئے، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مزار پر چالیس دن کا چلا کاٹا۔ ایک فقیر کی حیثیت سے مکہ شریف کی زیارت کی، آپ شیخ فرید الدین گنج شکر کے مزار پر بھی خلوت نشین ہوئے جو کہ خود بھی بہت بڑے صوفی تھے۔ گورونانک کی شاعری کا مجموعہ "گرنتھ صاحب" ہے۔ آپ کا کلام ابراہیم فرید چشتی کی شاعری سے لبریز ہے۔ بابانانک کا ورد جو کہ وہ ہمیشہ اور اکثر کرتے تھے وہ "ہو" رہا ہے۔ گرونانک کا طریقہ تبلیغ کا انداز بھی صوفیانہ کرام کی مانند تھا۔ آپ کے ڈیرے پر ہر مذہب کے لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ سکھ مت میں تصوف ایسے ہی پایا جاتا ہے جیسا کہ بُدھ مذہب میں یا کہ ہندو مذہب میں نظر آتا ہے۔ نانک نے بھی حق

اور سچّائی کی تلاش میں کافی علاقوں کا سفر کیا۔

منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر سکھ مت کے حوالے سے

منطق الطیر جدید دور حاضر کا ایک ایسا شاہکار ناول ہے کہ جس میں مصنف نے اپنی عمر کے آخری حصّے میں ایک ایسے موضوع کو قلم کی زینت بنایا ہے جو کہ مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ متصوفانہ انداز بھی نظر آتا ہے تصوف کا موضوع ایسا موضوع ہے کہ جس کی حقیقت سے انکار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ مختلف ادیبوں نے اس موضوع کو اپنے قلم کی زینت بنایا ہے جیسے عمیرہ احمد کا ناول بہت ہی خوبصورت اور دل چسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ بانو قدسیہ کی تحریروں میں اور اشفاق احمد کی تحریروں میں بھی اس کی واضح آثار نظر آتے ہیں۔ ناول منطق الطیر جدید آج کے اس دور میں علامتی ناول ہونے کے ساتھ فارسی کے مشہور شاعر خواجہ فرید الدین عطارؒ کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔

اُردو ادب میں مستنصر حسین تارڑ ایسی شخصیت ہیں کہ جنہوں نے خواجہ فرید الدین عطارؒ کی مثنوی سے متاثر ہو کر ناول" منطق الطیر جدید کو علامتی انداز میں بیان کیا۔ الہامی و غیر الہامی مذاہب کے تصوف اور صوفیانہ عوامل کو واضح کیا۔ تارڑ صاحب صوفی کو ایک خاص نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وسیع النظر انداز میں دیکھتے ہیں۔ ایسا انداز جیسا کہ آج سے کئی سو سال پہلے خواجہ فرید الدین عطار نے استعمال کیا۔ اُن ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ نے پرندوں کے ذریعے ہی مختلف مذاہب کے صوفیاء کو ٹلہ جوگیاں کے مقام پر اکٹھا کیا۔ سکھ مت کے تصوف کو اور ٹلہ جوگیاں کی تاریخی جگہ کو کیسے اُنہوں نے ناول میں احاطہ تحریر میں لایا وہ قابلِ ذکر اور توجہ طلب ہے۔ گورو نانک کی ٹلہ جوگیاں کے ساتھ کیا نسبت تھی اور کس طرح وہ ٹلہ جوگیاں آئے؟ اس کا احوال منطق الطیر جدید میں یُوں بیان کیا جاتا ہے۔

> "جیسے ہی پُر شکوہ آسمانی بلندی کے دامن میں ایک ایسا مقام ہوتا ہے، ایک ایسا بیس کیمپ ہوتا ہے جہاں ذرا ٹھہر کر اپنے آپ کو بحال کر کے اُس بلندی کو اسیر کرنے کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ ایسے ٹلہ جوگیاں کے دامن میں، قلعہ روہتاس کی بے مقصد اگرچہ پُر شکوہ فصیلوں کے سائے میں گورداورہ پہلی بادشاہی سری نانک کی مقدس زوال پذیر عمارت ایک ایسا ہی مقام یا بیس کیمپ تھا جہاں سے چڑھائی کا آغاز ہوتا تھا۔ بابا نانک نے اس مقام پر چالیس دن کا چلّہ کاٹا تھا۔ ٹلہ جوگیاں پر پہنچنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ جہاں اُنہوں نے ایک

مدت گیان دھیان میں بسر کی۔۔۔ یہ گوردوارہ اب تو چمگادڑوں س کا مسکن تھا"۔ (۴۶)

ٹلہ جوگیاں پہاڑی تاریخی اہمّیت کی حامل ایسی پہاڑی ہے کہ جس پر ہر مذہب کے صوفیاء نے یکے بعد دیگرے اپنے اپنے دور میں قیام کیا۔ ویسے تو اس پہاڑ کی بنیاد ایک گیانی گورکھ ناتھ نے رکھی تھی لیکن اس پہاڑی پر بڑے بڑے صوفیاء کرام بھی آئے، جن میں گورونانک بھی شامل ہیں۔ اُنہوں نے اس خانقاہ کی طرف سفر کیا۔ یہاں ٹلہ جوگیاں کے مقام پر ایک گردوارہ چوآصاحب کی بنیاد رکھی۔ اس کو چوآصاحب اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہاں پر گرونانک نے اپنی چھڑی سے ایک چشمہ نکلا اس پانی کے چشمے کو "چوا" کہتے ہیں۔ یہ گوردوارہ چوآصاحب کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ گوردوارہ قلعہ روہتاس کے دروازے کے ساتھ واقع ہے۔ یہ ایک ایسا مقام تھا کہ جہاں پر نانک نے چالیس دن قیام کیا اور پہاڑی پر پہنچنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی۔ آج کے اس دور میں اس گوردوارہ کی حالت اب ویسی نہیں رہی۔ اب تو یہ جگہ سنسان اور ویران ہو گئی ہے اور یہاں پر اب چمگادڑوں کا بسیرا ہے۔ یہ قلعہ آج کے اُس دور کی یاد تازہ کرتا ہے اور نانک نے جو قلعہ کی یاترا کی تھی اُس کی یاد تازہ کرتا ہے۔

"ٹلہ جوگیاں کے دامن میں چلّہ کاٹ کر ایک اور جوگی درویش اُدھر آیا تھا جس نے کہا تھا، سچّا ہے وہ آج بھی نانک، سچا ہو گا کل بھی وہ، اُس نے بھی تو انہی پتھروں کا سہارا لیا تھا۔ اُس کی ہتھیلی کے آثار بہت نمایاں تھے، اور پنجہ صاحب کہلاتے تھے"۔ (۴۷)

ناول نگار نے گورونانک کے سفر ٹلہ جوگیاں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اِس جوگیوں کی پہاڑی پر جہاں کئی شاہ اور بادشاہ آئے، مختلف جوگی وقت کے ساتھ یہاں پر آئے۔ کرشن آئے، جوگی بالناتھ، پُورن آیا، بھرتری ہری نے ٹلہ جوگیاں کی سمت سفر کیا وہی اس خانقاہ پر بابانانک آئے۔ گورونانک نے اس پہاڑ کے دامن میں چلّہ کاٹا، گیان دھیان کیا اور جس نے یہ کہا تھا کہ نانک کا سچّ رہتی دُنیا پر قائم رہے گا۔ اُس کی سچائی کی حقیقت ہمیشہ برقرار اور قائم دائم رہے گی یہ وہ عظیم درویش تھا کہ جس نے اپنی ذات کے کرشمے کو ثبت مہر کیا، جس نے مردانا کے ساتھ حسن ابدال کا سفر کیا اور باباولی قندھاری کی طرف سے گرائے گئے پتھر کو معجزاتی اور کراماتی طریقے سے روک لیا۔ اُس پتھر پر بابانانک کے ہاتھ کا پنجہ بن گیا۔ یہ پتھر آج بھی گوردوارہ پنجہ صاحب حسن ابدال میں محفوظ پڑا ہے ایک اور مقام پر ناول نگار بابانانک کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

"موسےٰ حسین ایک پل کے لئے ٹھٹک گیا کہ سفید چہرے کی مشابہت بابانانک کی

شکل ایسی دیکھائی دی تھی۔ میرے پاس رباب کہاں ہو گا۔۔۔ اس تہہ خانے میں کہیں۔۔۔ اُسے تلاش کرنا بے سود کہ اُس کی تاریں کب کی زنگ آلود ہو کر ٹوٹ چکی ہوں گی۔ جیسے میرے سانسوں کی تاریں ٹوٹنے کو ہیں ۔رباب کو توڑ دیا گیا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے گورو کے ماننے والے میرے چرنوں میں آکر بیٹھتے تھے اور جب میں اپنے رباب پر اشلوک چھیڑتا تھا جو میری نسل کے سائیں بھائی مردانا گایا کرتے تھے تو وہ لوگ میرے چرنوں میں نہ صرف پھول چڑھاتے تھے بلکہ ملکہ وکٹوریا کے سونے کے سکے بھی نظر کرتے تھے"۔ (۴۸)

موسٰے حسین حق کی کھوج میں ماضی کے ایک مایہ ناز موسیقار شمس الدین کے پاس لاہور کی ایک قدیم حویلی کے بوسیدہ تہہ خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ تہہ خانہ دھول اور مٹی سے اٹا ہوا تھا اور وہاں پر مکمل تاریکی کا راج تھا۔ اُسے اطلاع ملی تھی کہ اس خستہ حال تہہ خانے میں گرونانک کے فلسفہ حق کا پرچار کرنے والا رباب نواز زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ جب موسٰے حسین اُس شکستہ تہہ خانے میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ تہہ خانے کے کونے میں شمس الدین ایک تاریک کوٹھڑی میں ایک ایسی میلی چارپائی پر لیٹا ہے جس نے کئی برسوں سے دن کا اُجالا نہیں دیکھا۔ جب موسٰے حسین نے اپنے موبائل سے روشنی کی تو صدیوں سے اندھیرے کے عادی اس موسیقار کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اُس نے ڈرتے ہوئے دریافت کیا کہ کون ہے؟ جواباً موسٰے حسین نے جب اپنا نام بتایا تو بزرگ نے اُس کی آمد کی وجہ دریافت کی تو اس پر موسٰے حسین نے جواب دیا کہ میں اس واحد نیت کی تلاش میں آیا ہوں۔ جو آپ کی رباب کی زینت بنتی تھی بوڑھے کے کہنے پر جب موسٰے حسین اپنے موبائل کی روشنی گل کرنے لگا تو ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا کہ اُس بوڑھے رباب نواز کی شکل بابانانک سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اسی دوران بوڑھے موسٰے حسین کی کیفیت سے بے خبر غم و یاس سے گویا ہوا کہ مذہبی تعصب کے شکار کچھ لوگوں نے اُس کے رباب کو تار تار کر دیا ہے۔ اب اس تہہ خانے کے کسی گوشے میں بے کار پڑا گل سڑ رہا ہے۔ بوڑھا ماضی کے حسین لمحوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے اُس کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ گورونانک کے پیروکار اُس سے خاص اُنسیت رکھتے تھے جب وہ اپنے رباب پر گرونانک کے فلسفیانہ کلام کو چھیڑتا تو وہ اُس کے قدموں میں نہ صرف پھول نچھاور کرتے بلکہ اُس زمانے کی کرنسی سے بھی اُسے نوازا جاتا۔

"پاکستان قائم ہونے کے بعد بھی سرحد پار سے کچھ لوگ کھوج کرتے مجھ تک

آجاتے اور میرے رزق روز گار کا سلسلہ چلتا رہتا تھا لیکن اب تو جانے کیوں ہم ایک دوسرے کے ایسے بیری ہو گئے ہیں کہ ایک مدت سے نہ کوئی آیا نہ کوئی گیا۔۔۔اس ہندو حویلی پر جتنے بھی لوگ قابض ہیں اُن کی مہربانی ہے کے یہاں پڑا رہنے دیتے ہیں ،دو وقت کی روٹی دے جاتے ہیں ، کبھی بھول بھی جاتے ہیں ۔۔۔اور اُن کی نوجوان نسل کے کچھ لوگ تو مجھے مُرتد کہتے ہیں کہ میں بابا نانک کے گیت گایا کرتا تھا۔۔۔ اُنہوں نے میرا رباب تار تار کر کے اسی تہہ خانے میں پھینک دیا ورنہ میں اُسے گلے سے لگا کر دم دیتا"۔(۴۹)

بوڑھا شمس الدین سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی حالات ٹھیک رہے۔ حق کی پہچان رکھنے والے اور حق کی راہ پر چلنے والے لوگ میرے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وہ سب کُھلے دل و دماغ کے لوگ تھے واحدنیت کو مذہب اور قید وبند سے آزاد رکھتے تھے۔ وہ عالمگیر امن وآشتی کے خواہاں تھے اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی اپنے ہمسایہ ملک سے لوگ میرا سراغ لگاتے لگاتے مجھ تک پہنچ جاتے وہ میرے فن کے قدردان تھے۔ میری تعظیم کرتے تھے۔ مجھے نوازتے تھے اور میرے روز گار کا ذریعہ بن جاتے تھے لیکن وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ ہم نے دلوں میں ایسی کدورتیں پالیں ،ایسے پتھر دل ہوئے کہ اپنے علاوہ ہمیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہم اپنے اپ کو برتر گرداننے لگے ہم نے یک طرفہ حدود و قیود متعین کر لیں اور متصعب ہو گئے۔ سنہری اصولوں کو چھوڑ کر صند کو اپنا لیا۔ ہم نے روح کو چھوڑ کر محض سطحی چیزوں کو تعصب کا چشمہ لگا کر دیکھا تو ہمیں گرو نانک جیسے امن پسند جوگی کا کلام اور فلسفہ بھی اسلام کے منافی لگا۔ اس متعصب یلغار نے مجھے اِس ویران حویلی کو کسی فالتو چیز کی مانند رکھ دیا ہے۔ جہاں میں اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہا ہوں۔ یہاں اب کوئی نہیں آتا، یہ بھی اُن لوگوں کا احسان ہے کہ مجھے دو وقت کی روٹی دے جاتے ہیں اور کبھی نہیں بھی دیتے یہ صد شکر ہے کہ مجھے یہاں سے نہیں نکالتے حالانکہ اُن کی نوجوان نسل مجھے گمراہ کہتی ہے کہ میں گرونانک کی نغمہ سرائی کرتا تھا۔ انہی لوگوں نے مجھ پر ظلم عظیم کیا کہ میرے رباب کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس تہہ خانے میں پھینک دیا ورنہ میں اس گلے لگا کے رکھتا اور کبھی خود سے جُدا نہ کرتا۔

"وہ دونوں۔۔۔ اپنے اپنے رباب بجاتے کہ نانک بھی ایک رباب نواز تھا،پنجاب کے گاؤں گاؤں بھٹکتے پھیرتے وہ وحدانیت کے گیت گاتے پھرتے تھے۔ ایسے نانک، ایسے

جتنے بھی اُس کی ذات میں گُم قریہ قریہ گھومنے والے اُس کے صوفی بندے تھے وہ سب کے سب شاعر اور موسیقار تھے۔۔۔بُلھے شاہ بھی اپنی کافیاں اپنے ساز کی سنگت میں کوچہ کوچہ گاتا پھرتا تھا۔یہ ساز ابھی تک اُس کے مدفن کے پہلو میں محفوظ ہے۔۔۔شاہ لطیف بھٹائی کی ستار اُس کے مزار سے متصل ایک شوکیس میں دیکھ لو۔۔۔سچل سرمست بھی اپنا اِکتارہ لیے پھرتا تھا۔۔۔شاہ حسین اور شہباز عثمان مروندی قلندر بھی اپنا کلام پڑھتے تھے"(۵۰)

یہاں پر ناول نگار مختلف شخصیات کا موازنہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ وہ کونسی مشترک قدریں تھیں جو بظاہر اُن کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اُنہیں ایک ہی منزل کے راہی ظاہر کر رہی تھیں۔وہ دونوں اپنے اپنے ساز بجانے میں مگن تھے اور اس حد تک ڈوب چکے تھے کہ اُنہیں ارد گرد کی مطلق پرواہ نہیں تھی۔بابا نانک بھی در حقیقت ایک موسیقار تھا۔اُس کی موسیقی روح کو سیراب کرتی تھی۔پنجاب کے قریہ قریہ وہ گھوم کر خالقِ حقیقی کی واحدنیت کے سُر بکھیرتا تھااور اُس کے پیروکاروں کی جو جماعت تھی اُس نے گرونانک کی روش پر چل کر اسی کام کو اپنا مقصد حیات بنایا یہ تمام صوفی ذاتی مفاد اور مادی ضروریات سے مبرا تھے اُن کا مقصد انسانیت کی فلاح تھا۔اُن کے بول میٹھے تھے۔تبلیغ کا انداز منفرد تھااور اُن کے کلام میں نغمگی تھی یہی وجہ تھی کہ لوگ بظاہر درویش ہونے کے باوجود لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتے تھے یہ شاعروں اور موسیقاروں کی طرح لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے تھے،اُنہیں واحدنیت کی تبلیغ کے لئے زیادہ جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔محض میٹھا بول اور اخلاص ہی اُن کے فلسفے کے پرچار کے لئے کافی تھا۔بُلھے شاہ نے بھی اپنے کلام کو موسیقی کا رنگ دیااور وہ اپنے ساز اور پیغام کو گلی گلی لئے پھیرتا،لوگوں کو فلسفہ حق سے آگاہی دیتا اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ بُلھے شاہ کا ساز آج بھی اُس کے مزار پر موجود ہے،جو اُس کے موسیقار ہونے کی گواہی دیتاہے۔اِسی طرح شاہ لطیف بھٹائی کا ساز بھی اس کی خانقاہ میں موجود ہے۔سچل سرمست بھی اپنا ساز اپنے کلام کی تشہیر کے لئے استعمال کرتا تھا۔شاہ حسین اور شہباز عثمان مروندی بھی اپنا اپنا کلام گاتے تھے اور اُن کے کلام میں اس قدر سوز و گداز ہوتا کہ وہ سیدھا لوگوں کے دلوں میں جا کر اُترتا اور لوگ جوق در جوق اُن کی صحفوں میں شامل ہو جاتے،نبیوں کے بعد ان صوفیائے کرام نے اپنی نرم خوئی سے لوگوں کو ہدایت کی راہ پر گامزن کیا۔

"موسٰے حسین کہاں جانتا تھا کہ ایک معمولی ٹیلے کی چڑھائی کے دوران اُسے ایسے

لوگ ملیں گے جو گزر چکے ،زمانوں میں گزر چکے تھے۔۔۔اُسے گمان یہی ہوا کہ وہ ایک خواب اندر خواب میں ہے اور اگر وہ اُس آخری خواب میں بیدار ہو گیا تو مر جائے گا تو وہ نہیں جاگا۔اُسی خواب میں مبتلا رہا اور اُس نور والے درویش سے سوال کیا جو مردانے کے رباب کے تاروں کی دُھن پر وجد میں آتا اُس کی جانب چلا آتا تھا۔باباجی۔۔۔آپ اپنے آبائی قصبے تلونڈی سے جُدا ہوئے جو آپ کی نسبت سے نانک والا ننکانہ ہو گیا۔۔۔بہت دیس گھومے ، نگر نگر خاک چھانی۔۔۔تو آج اِدھر ٹلہ جوگیاں کی جانب کیوں رُخ کر لیا۔۔۔کیا ابھی تک سچے سودے کی تلاش میں ہو؟"(۵۱)

موسٰے حسین جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے،اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ ایک عام سے پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اُس کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہو گی کہ جن کو گزرے ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔ٹلہ جوگیاں پہاڑ پر چڑھتے ہوئے قدم قدم پر اُس کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہو رہی تھی جو روحانی اعتبار سے بلند درجہ کے مالک تھے۔اُسے یہ سب کچھ خواب سالگ رہا تھا بلکہ اُسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے خواب کے اندر بھی کوئی خواب ہے،ایک سحر انگیزی اُس پر طاری تھی۔اُسے یہ بھی ڈر تھا کہ وہ آخری خواب جو وہ دیکھ رہا ہے اگر اُس میں وہ جاگ گیا تو سب کچھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اس لیے اُس نے اپنے آپ کو جاگنے سے روکا۔خواب میں اُس کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو کہ سازندے کے ساز چھیڑنے پر بے اختیار ہو کر سرور کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے تھے اس موسیقار کے سُر اُنھیں اپنی طرف کھنچتے تھے،موسٰے حسین نے فوراً سے اُس بزرگ کو پہچان لیا۔یہ یقیناً بابا گرونانک تھے،اُن کا نورانی چہرہ بالکل واضح تھا۔موسٰے حسین نے بابا نانک سے سوال کیا کہ باباجی آپ نے اپنی جائے پیدائش تلونڈی کو چھوڑ دیا۔جو آپ کی وجہ سے نانک والا یعنی کہ ننکانہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔آپ نے مختلف ممالک کی سیاحت کی، قریہ قریہ حق اور سّچائی کا پیغام پہچانے کے لئے گئے۔آج آپ کو ٹلہ جوگیاں جانے کی حسرت کیوں ہوئی؟کیا اب بھی سّچائی کے لئے آپ کی تلاش جاری ہے۔کیا ابھی تک آپ نے حق کا نہیں پایا؟کیا اب بھی آپ کی پیاس باقی ہے۔موسٰے حسین اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ گورونانک ابھی تک حق کی تلاش میں ہیں۔کیا ابھی تک اِن کی ریاضت مکمل نہیں ہوئی۔اس پر گورونانک نے جواب دیا۔

"میرے بھائی سنُو،،اُنہوں نے اپنی گھنی سفید لشکیلی داڑھی پر ہاتھ پھیرا،یہ داڑھی

ایک ایسا گھونسلا ہے، جس میں تمام ایمانوں کے پنکھ پکھیرو امن وآشتی سے قیام کرتے ہیں۔۔۔ یہ بیک وقت کرشن اور کالی کملی والے کے نُور اندر نُور سے ہی نُور ہی نُور ہے۔۔۔ اِن دونوں پکھیروؤں کے گیت میں نے سب کے سب سچ مان کر جان کر ایک ہی گیت میں ڈھال دیئے ہیں۔۔۔ کوئی بھی نیا عقیدہ پچھلے عقیدوں کی مکمل نفی کرتا بلکہ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اُسی راستے کا مسافر ہو جاتا ہے۔ جو ازل سے طے شدہ ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔ میں نے بھی کوئی نیا دھرم ایجاد نہیں کیا۔ کرشن اور کملی والے کو ایک ہی مالا میں، نفرتیں اور کدورتیں ختم کرکے اُن کو ایک ہی لڑی میں پرو کے اس سرزمین کو تعصب کے زہر سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے" (۵۲)

موسٰے حسین کے سوال پر بابا نانک اپنی سفید نورانی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئے کہ اُن کی داڑھی ایک ایسی جگہ ہے جہاں تمام مذاہب کے پرندے امن و آشتی اور بردباری کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ پکھیرو کسی تعصب کا شکار نہیں ہیں۔ یہاں بیک وقت کرشن بھگوان اور نبی ﷺ براجمان ہیں۔ یہ داڑھی تمام مذاہب کا مسکن ہے۔ ان تمام سچّے مذاہب نے اس کو مسکن بنا دیا ہے۔ بابا نانک نے مزید یہ کہا کہ میں نے ان دونوں مذاہب کے سچّ کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے کیونکہ دونوں کے طریقہ کار میں فرق ہونے کا باوجود روح ایک ہی ہے۔ درحقیقت ہر مذہب نے انسانیت کی فلاح و بہبود کا درس دیا ہے اور اسی کو ہر حال میں مقدم جانا ہے۔ تمام مذاہب نے بنی نوع انسان کو امن و آشتی کا پیغام دیا ہے۔ کوئی بھی نیا مذہب پچھلے مذہب کو غلط قرار نہیں دیتا بلکہ نیا عقیدہ پچھلے عقیدے کی ہی ایک کڑی ہوتا ہے۔ سب مذاہب ایک ہی منزل کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ میں بھی کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آیا بلکہ میرا عقیدہ بھی وہی ہے جو ابتداء سے قائم ہے اور روزِ قیامت تک موجود رہے گا۔ میں نے بھی کرشن بھگوان کی اور نبی آخر الزماں ﷺ کی تعلیمات کو یکجا کرکے لوگوں کو اتفاق واتحاد کا درس دیا ہے اور اُنہیں زمین سے نفرتیں اور بغض کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔

"میں نانک قینچی نہیں جو کاٹتی ہے، ایک سوئی ہوں جو جوڑتی ہوں۔۔۔ بُلھے شاہ کی مانند۔۔۔ ہندو نہیں، نا مسلمان۔۔۔ ضلع کُل کا مارک لیا۔۔۔ اسی لئے جب میں اپنی خاکی اور عارضی موجودگی سے بظاہر ناموجودگی کے جہان میں منتقل ہوا تو مجھے جلایا بھی گیا اور دفنایا بھی گیا۔۔۔ اور اگر تمہیں یہ بجھارت پریشان کرتی ہے کہ میں آج ٹلہ

جوگیاں کی مسافت پر کیوں کمر بستہ ہُوں تو جان لو کہ سچ کی تلاش کا کوئی انت نہیں ہوتا۔۔۔میں بنارس گیا، گنگا کے پانیوں سے اشنان کیا۔۔۔مکّے گیا، زمزم کے پانی پیئے، اللہ کے گھر کے گرد پھیرے لگائے۔۔۔بغداد کے ایک قبرستان میں گیان دھیان کیا پر پھر بھی ایک خلش باقی رہی۔۔۔اس ٹلے کے دامن میں چلّہ کاٹا پھر بھی تشفی نہ ہوئی تو اباس کی چوٹی کی جانب سفر کرتا ہوں۔۔۔وہاں پہنچ کر کچھ دن ٹھہروں گا۔۔۔کیا پتہ وہاں مجھ پر بھی اقراء کا کوئی حکم نازل ہو۔خلش کا مدواہو، تشفی ہو جائے ۔۔۔کچھ سوالوں کے جواب وہاں مل جائیں" (۵۳)

بابانانک نے موسٰے حسین کو جواب دیا کہ میرا مذہب بھی کوئی قینچی کی مانند نہیں یکجا چیزوں کو کاٹ دے اور اُس کو آپس سے الگ کر دے۔ جس سے تفرقہ پیدا ہو اور جو منتشر کر کے خوبصورتی کو بدصورتی میں اور اُس کو بد امنی میں تبدیل کر دے۔میرا مذہب تو ایک سوئی کی مانند ہے جو بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کر کے ایک ہار میں پرو دیتا ہے۔میں تمام مذاہب اور تمام عقائد کو مانتا ہوں۔میں کسی بھی مذہب یا عقیدے کی نفی نہیں کرتا، میں تمام مذاہب کے اتحاد اور اُس کا حامی ہوں، میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں پھیلانا چاہتا، میں صوفی بزرگ بُلھے شاہ کی طرح نہ تو ہندو ہوں نہ ہی مسلمان، میں اپنے آپ کو کسی خاص حد میں رکھ کر اور خود کو سب سے بہتر کہہ کر اس سرزمین میں تعصب نہیں پھیلانا چاہتا۔بظاہر ایک عام انسان کی طرح مجھے بھی طبعی موت آئی لوگوں نے مجھے بھی جلایا اور عام لوگوں کی مانند دفنایا لیکن اُس کے باوجود آج صدیوں بعد بھی میں تمہارے سامنے ٹلہ جوگیاں پر موجود ہوں ۔یہی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی کہ میں اتنی دقت کیوں اُٹھا رہا ہوں۔میری سچ کی جستجو ختم نہیں ہوئی، روحانیت کا کوئی انت نہیں ہوتا۔اب خالق کے رازوں کو کوئی حتمی طور پر نہیں جان سکتا یہ راستہ بہت کھٹن ہے، یہاں صدیاں بیت جاتی ہیں، انسان کی تشنگی برقرار رہتی ہے، آپ سیر اب نہیں ہو پاتے۔میں نے دُنیا کا کوئی کونہ نہیں چھوڑا، میں بنارس میں گیا، دریائے گنگا کے پانی سے غسل کر کے اپنی روح کے میل کو کو صاف کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کے میری اندر کی خلش مجھ کو مکہ مکرمہ میں لے گئی۔وہاں کا آبِ زم زم پیا کعبہ شریف کے گرد طواف کیا، میں نے ہر اُس مقام کو کھوجا جہاں میری روح کی تسکین ہو سکتی تھی۔میں بغداد شریف گیا وہاں پر ایک قبرستان میں گیان دھیان میں محو ہو کر خالقِ حقیقی کے رازوں کو جانتا رہا مگر پھر بھی میرے اندر کی پیاس جوں کی توں برقرار رہی۔ٹلہ جوگیاں کے پہاڑ کے دامن میں میں نے چلّہ کاٹا لیکن پھر بھی میری تسکین نہیں ہوئی اب میں اس پہاڑ کی چوٹی کی طرف رواں دواں ہوں وہاں

پہنچ کر میں کچھ دن قیام کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ پر بھی غار حرا کے باسی جیسا کوئی حکم نازل ہو جائے، میری روح سیر اب ہو جائے، میری تشنگی ختم ہو جائے، میرے دل کو قرار آجائے، میرے اندر اُٹھتے ہوئے سوالوں کے جواب مل جائیں اور میری تلاش ختم ہو جائے۔

"موسےٰ بابا کی من موہ لینی باتوں میں اتنا مگن تھا کہ چونک میں آگیا۔ "آپ مجھ سے مخاطب ہیں " ہاں۔۔۔مجھے اِس پانچ دریاؤں کے دیس کے باسیوؤں سے ایک شکایت ہے اور تم بھی اُن میں شامل ہو۔۔۔یہ کیا ہے کہ تم صرف اُن پیغامبروں کے پیغام پر ہی کان دھرتے ہو جو دُور دیسوں کی بستیوں میں اُترے اُنہوں نے جو سبق پڑھایا تمہیں مشکل سے یاد ہوا کہ اُن کی زبانوں سے تمہارے کان نا آشنا تھے اور تم نے مجھ سے محض اس لئے غفلت برتی کہ میں تمہاری مادری زبان میں تمہیں اپنے ربّ کی طرف بلاتا تھا، جن زبانوں کو تم سمجھتے ہی نہیں تھے اُن کا اعتبار کیا اور جو زبان تم بولتے تھے اُس میں اُترنے والے صحیفوں کو درخود اعتنا نہ جانا۔۔۔میرے گرنتھ صاحب میں ذات پات اور دیس بھیس اور مذہب کی کوئی تخصیص نہیں۔۔۔میرے علاوہ سب صوفی سنتوں اور درویش بھگتوں کا کلام شامل ہے" (۵۴)

موسےٰ حسین بابا نانک کی میٹھی گفتگو میں اس قدر مشغول تھا کہ اُسے اِس بات کی مطلق پرواہ نہ رہی کہ وہ اُس سے محو کلام ہیں۔ موسےٰ حسین حیرت زدہ انداز میں بابا نانک سے جب مخاطب ہوتا ہے تو بابا نانک فرماتے ہیں کہ اُنہیں پنجاب میں رہنے والوں سے ایک بہت بڑا گلہ ہے اور اُن لوگوں میں موسےٰ حسین بھی شامل ہے۔ تم پنجابیوں نے اُن پیغمبروں کی باتوں کو مان لیا اُن کے عقیدے پر چلنے لگے جو تم سے میلوں دور کے دیسوں کے باسی تھے۔ اُن کے پیغام کو سمجھنے میں تمہیں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا کیونکہ تم اُن کی زبانوں سے نابلد تھے اور مجھ سے تم لوگ محض اس سبب دور رہے کہ میں تم لوگوں کے اپنے خطے کا باسی تھا اور تمہاری اپنی زبان میں تمہیں رب کی وحدانیت اور فلاح انسانیت کا درس دیتا تھا۔ جن زبانوں سے تم آشنا ہی نہ تھے اُن زبانوں میں اُترنے والے صحیفوں کو تم لوگوں نے من و عن تسلیم کر لیا اور وہ ہدایت کی کُتب جو تمہاری اپنی مادری زبان میں ہیں اور جنہیں سمجھنا تم لوگوں کے لئے چند امشکل نہ تھا اُنہیں تم خاطر میں نہ لائے۔ اُن کے بارے میں تم ہمیشہ تعصب کا شکار رہے۔ میری مذہبی کتاب گرنتھ صاحب میں ذات پات، رنگ، نسل، اور مذہب کا کوئی امتیاز نہیں ہے یہ سب لوگوں کے ہدایت کا سرچشمہ ہے اور جو چاہے اس کی تعلیمات لافانی سے

سیر اب ہو سکتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں میری تعلیمات کے ساتھ ساتھ تمام صوفیوں، درویشوں، بھگتوں اور مذاہب کی تعلیمات موجود ہیں جو روز آخرت تک انسانیت کی راہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتی رہے گی۔

حاصلِ بحث

"منطق الطیر جدید" ایسا ناول ہے کہ جس میں غیر الہامی پرندوں کا ذکر بھی خاص طور پر کیا گیا ہے۔ یہ ناول تمام مذاہب کا ترجمان ہے اور ہر مذہب کے پرندوں کو علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس میں بُدھ مت مذہب کی متصوفانہ روایات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ گوتم بُدھ جو کہ بُدھ مت مذہب کے بانی ہیں وہ خود صوفی ازم کی ایک زندہ مثال تھے۔ اُنہوں نے حقیقت کو تلاش کرنے کے لئے اور رب کا کھوج لگانے کے لئے جنگلوں کا اور ویرانوں کا رُخ کیا۔ اِس کام کے لئے اُنہوں نے بھوک، پیاس، گرمی، سردی ہر قسم کے مسائل کا سامنا کیا۔ نروان (نجات) حاصل کرنے کے لئے مختلف تکالیف کو برداشت کیا۔ بُدھ کی پسلیوں سے نکلنے والے اُس پرندے نے بھی ٹلہ جوگیاں کا سفر اختیار کیا۔ گوتم بُدھ کے فاقہ زدہ بدن سے جس پرندے نے اُڑان بھری در حقیقت میں وہ حق اور سچّائی کی تلاش میں تھا۔ سچّائی کی تلاش تو ہندو یوگیوں میں بھی تھی۔ وہ بھی کئی کئی دن بھوکے رہتے اور لمبے فاقے کاٹنے کے لئے مختلف انواع کی مشقیں کرتے تھے۔ ہندو مذہب میں راجہ چندر سین کا بیٹا بھرتری ہری تھا جس کا تعلق حکمران خاندان سے تھا۔ جب اُس کے ساتھ زندگی میں دھوکہ ہوا تو اُس نے بھی سب کچھ چُھوڑ کر درویشانہ زندگی کا آغاز کر دیا۔ بھرتری ہری کا تعلق بھی ٹلہ جوگیاں سے خاص قسم کا تھا۔ ایک اور ہندو یوگی گورکھ ناتھ بھی تھا جس نے ٹلہ جوگیاں کا سب سے پہلے رُخ کیا اور راجہ سلوان کے بیٹے پُورن کو بھی وہ اپنے ساتھ لے کر ٹلہ جوگیاں میں آیا۔ پُورن یہاں سے پھر بھگت بن کر آیا اور اسی کی دُعا سے "لونا" کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ (لُونا پُورن کی سوتیلی ماں تھی)۔ سکھ مت کا جائزہ لیں تو بابا نانک کی زندگی میں متصوفانہ واقعات رونما ہوئے اور نانک کا ذہن بھی کم عمری میں ہی اِس طرف مائل ہو گیا تھا۔ گرو نانک بھی مختلف علاقوں کا سفر کرتے ہوئے ٹلہ جوگیاں آئے اور پہاڑ پر چڑھنے کی پہلے باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ یہاں پر چالیس دن چلّا کاٹا۔ اس کے علاوہ مکہ معظمہ اور مدینہ شریف کا سفر کیا، بغداد شریف میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے دربار پر گئے۔ بابا نانک نے ساری زندگی راہ تصوف میں گزاری۔ آپ نے چالیس دن خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے دربار پر بھی چلہ کاٹا۔ بابا نانک کی شاعری میں بھی صوفیانہ رنگ ملتا ہے۔ آپ کی شاعری کا مجموعہ "گرنتھ صاحب" کتاب ہے، جس کو سکھ مذہب میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اکرم رانا، پروفیسر، ڈاکٹر، بین الاقوامی مذاہب، پورپ اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۹، ص ۸۸

۲۔ ماتھر، موہن لال، ہندوستانی فلسفہ، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۹

۳۔ سمنتھ ناتھ دت، سری کرشن، گوتم بُدھ اور دوسرے رہنما، خُدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۱

۴۔ عماد الحسن آزاد فاروقی، دُنیا کے بڑے مذاہب، ادارہ تاریخ و ثقافت اسلامیہ،، لاہور، دسمبر ۲۰۱۸، ص ۸۵

۵۔ حفیظ سیّد، ڈاکٹر، گوتم بُدھ سوانح حیات و تعلیمات، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۲ء ص ۷۵

۶۔ میکش اکبر آبادی، مسائل تصوف، بک ہوم لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۴۲

۷۔ مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر جدید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۲۔ ایضاً، ۱۰۷

۱۳۔ نہرو، جواہر لعل، تلاش ہند، ادارہ تخلیقات، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۹۰

۱۴۔ عماد الحسن آزاد فاروقی، دُنیا کے بڑے مذاہب، ادارہ تاریخ و ثقافت اسلامیہ، لاہور، دسمبر ۲۰۱۸، ص ۲۶

15.SF.Mahmud, concise history of indo-Pakistan,Oxford University Press,New York,1989, P 15.

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اُردو کی لغت، طبع سوم، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۷

۱۷۔ راجسیوراؤ اصغر، راجہ، ہندی اُردو لغت، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ۱۹۹۷، ص ۴۸۰

۱۸۔ عبد السلام، اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۹۶۶

۱۹۔ نارائن آر۔ کے، مہابھارت، ترجمہ نعیم احسن، نگارشات، ۱۹۹۹ء، ص ۵

۲۰۔ رسالہ، دیا نرائن نگم، زمانہ کانپور ۱۹۴۲، ۱۹۰۳ سے انتخاب، ہندو مت، خُدا بخش اور نیٹل پبلک

لائبریری، پٹنہ، س۔ن، ص۱۶۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۲۲۔ محمد اکرم رانا، پروفیسر، ڈاکٹر، بین الاقوامی مذاہب، ص۵۱

۲۳۔ ابن حنیف، بھارت، بیکن بکس، ملتان، س۔ن، ص۲۰

۲۴۔ محمد اکرم رانا، پروفیسر، ڈاکٹر، بین الاقوامی مذاہب، ص۴۸

۲۵۔ مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر جدید، ص۱۰

۲۶۔ ایضاً، ص۱۱

۲۷ ایضاً، ص ۱۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۸

۲۹۔ ایضاً، ص ۴۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۷

۳۱۔ ایضاً، ص ۵۲

۳۲۔ ایضاً، ص ۷۷

۳۳۔ ایضاً، ص ۹۷

۳۴ ایضاً، ص ۱۲۸

۳۵ ایضاً، ص ۱۲۹

۳۶ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۸ ایضاً، ص ۱۳۱

۳۹ ایضاً، ص ۱۳۲

۴۰۔ رابرٹ وین ڈی ویئر، مترجم یاسمین خالد، سکھ مت تاریخ ،حیات وتعلیمات، فکر و فلسفہ، شاہد پبلیکیشنز، چوبرجی سنٹر، ملتان روڈ، لاہور، س۔ن، ص۱۳

۴۱۔ جی۔ این۔ امجد، پروفیسر، گرونانک جی اور سکھ مت، مطبوعہ لاہور، س۔ن، ص۲۵

۴۲۔ رابرٹ وین۔ ڈی ویئر، مترجم یاسمین خالد، سکھ مت، تاریخ، حیات وتعلیمات، فکر وفلسفہ، ص۱۸

۴۳۔ ایضاً، ص ۳۱

۴۴۔ عماد الحسن آزاد فاروقی، دُنیا کے بڑے مذاہب، ص ۲۱۵

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۱۶

۴۶۔ مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر جدید، ص ۲۷

۴۷ ایضاً، ص ۷۷

۴۸ ایضاً، ص ۱۳۷

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۴۲

باب سوم:

منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر (الہامی مذاہب کے حوالے سے)

(الف) یہودیت کے حوالے سے

یہودیت کا لفظ "ھاد" سے ماخوذ ہے۔ "ھاد" کا لفظ توبہ کرنے والے اور رجوع کرنے والے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہودی مذہب کا شمار اہم الہامی مذاہب میں ہوتا ہے۔ دُنیا میں اس وقت یہودی مذہب کے پیروکاروں کی تعداد ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ یہودیوں کا تعلق ایک مخصوص نسل سے ہے اور یہ لوگ اپنی نسلی خصوصیات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ یہودی مذہب بھی توحیدی اور ابراہیمی ادیان میں سے ایک دین ہے۔ مذہب اسلام کی رو سے اِس مذہب کے ماننے والے "قوم بنی موسٰی علیہ السلام" یا پھر "بنی اسرائیل" کہلاتے ہیں۔ یہودیوں کا تعلق حضرت یعقوبؑ کی اولاد سے ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب "اسرائیل" تھا، جس کا مطلب ہے عبد اللہ یعنی "اللہ کا بندہ"۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے جبکہ حضرت یوسفؑ آپؑ کے بیٹے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نبوت والا علاقہ کنعان تھا، کنعانی لوگ جن کو عبرانی بھی کہا جاتا ہے وہ آپؑ کو "اسرائیل" یعنی اللہ کا بندہ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ یہودی مذہب کے پیروکار کتاب توراۃ پر عمل پیرا ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور حضرت موسٰی علیہ السلام کو اپنا آقا، رہبر تسلیم کرتے ہیں۔ یہودی مذہب کے لوگوں کے مذہبی عقائد زیادہ تر عبرانی تھے۔ اُس کی اہم وجہ یہ تھی کہ اُن کا تعلق بھی عبرانی نسل سے تھا۔ پیغمبر خُدا حضرت موسٰیؑ کی پیدائش سے پہلے بنی اسرائیل کی قوم اَن گنت معبودوں کی عبادت کرتے تھے۔ اِن معبودوں کو عام طور پر تین قسم کے گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

i. خاندانی دیوتا

اُس وقت یہ لوگ دیوتا کی مختلف مورتیاں بناتے تھے اور اُن کی پُوجا کرتے تھے۔ ہر خاندان کا مختلف دیوتا ہوا کرتا تھا، اُن دیوتاؤں کی جسامت اس طرح بناتے اور اس شکل میں بنائی جاتی تاکہ ایک جگہ سے جب دوسری جگہ جانا پڑ جائے تو اُس کے لئے آسانی ہو، آسان طریقے سے دیوتا کو دوسری جگہ منتقل کیا جاسکے۔ خاندان کی کامیابی اور خوش حالی کا تمام تر دارومدار اِن دیوتا پر ہوتا تھا۔

ii. حجر پرستی

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے یہودی مذہب کے ماننے والے لوگ مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ اِن پتھروں کو بہت مقدس مانتے اُن کی باقاعدہ پُوجا کی جاتی تھی۔ وہ اِن پتھروں کو اس لئے بھی مقدس تصّور کرتے تھے کہ پھر ان ہی پتھروں سے وہ اپنے ہاتھ سے اپنا معبود بناتے جس کو وہ اپنا خُدا تصّور کرتے تھے۔ اِن مقدس پتھروں کا تعلق مختلف قسم کے درختوں کے ساتھ بھی ہوتا تھا۔ عبرانی لٹریچر میں جس جگہ پر مقدس پتھروں کا ذکر آیا ہے وہی پر مقدس درختوں کا بھی خاص ذکر آیا ہے۔ حجر پرستی، درخت پرستی کے علاوہ یہودیوں میں حیوانات پرستی کا رجحان بھی عام تھا۔

" بنی اسرائیل بعض جانوروں کو بھی پُوجتے تھے، جن میں بیل اور سانپ خاص تھے۔ بیل "دان" اور بیت ایل میں ایک نوجوان بیل دیوتا کی پُوجا کو جاتا تھا۔ خروج میں اسرائیلوں کا ایک "سنہری بچھڑا" بنا کر پوجنے کا ذکر ہے "[1]

مصری لوگوں کی حیوان پرستی کے زیر اثر یہودی مذہب کے لوگ بھی جانوروں مثلاً گائے، بیل وغیرہ کی پُوجا کی جاتی تھی۔ مصری لوگوں کے نزدیک سانپ مقدس چیز تھی۔ باقاعدہ طور پر سانپوں کی عبادت کی جاتی۔ یہ لوگ حیوان پرستی کے بہت زیادہ قائل تھے۔ جب موسیٰؑ کوہ طور پر چالیس دن کے لئے گئے تو تب بھی اُن کی قوم بچھڑے کی عبادت میں لگ گئی۔

iii. قومی دیوتا

خاندانی دیوتاؤں کے علاوہ یہودی کچھ قومی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن اس بارے میں حتمی رائے یا تفصیلی طور پر کچھ خاص نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ جب قوم یہود توحید کی طرف راغب ہوئی تو اُن قومی دیوتاؤں کا نام ونشان مٹ گیا تھا۔ عام طور پر دو قومی دیوتاؤں کے نام ملتے ہیں لعل، مولک۔ یہ دونوں معبود مقامی یہودیوں کی روحیں تھیں جن کی پُوجا کی جاتی تھی۔ یہودیوں کے نزدیک "لعل" دیوتا" زرخیزی کا دیوتا تھا، جبکہ "مولک دیوتا" آگ کا دیوتا تھا۔ مولک دیوتا کی پُوجا یہودی مذہب کی طرح کئی قومیں کرتی تھی۔ اسرائیل قوم اس کو باقاعدہ اپنا معبود مانتی اور اپنے بچّوں کی قربانیاں بھی اس دیوتا کے لئے دی جاتی تھی۔ پروفیسر محمد اکرم اس ضمن میں لکھتے ہیں:-

"ان میں لعل اور مولک خاص تھے، اہل کنعان پر اُن کی پرستش فینقیوں سے آئی اور جب کنعانیوں کو بنی اسرائیل نے شکست دی اُور اُن کے ملک پر قابض ہوگئے تو ان

معبودوں کی پرستش کرنے لگے۔ بعض قنیقیوں کا معبود زرخیزی وبار آوری کا دیوتا تھا۔اس لفظ کے معنی "آقا" یا "مخدوم" کے ہیں۔ہر جگہ کے الگ الگ لعل تھے"(۲)

توحید کا کوئی تصّور ہی نہ تھا۔یہودی "دیوتا" کو اپنا معبود تصّور کرتے۔اُن کا دیوتا کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر تھا، کہ دیوتا جو اُن کے معبود ہیں وہ تمام انسانوں سے زیادہ منظم اور قوت میں ہیں۔اس لئے یہ دیوتا اُن کی دُعا کو بغور سنتے ہیں اور عام انسان کی مدد بھی کرتے ہیں، مصیبت میں ہر دُکھ کا مدوا بھی کرتے ہیں۔

حضرت موسٰی علیہ السلام

حضرت موسٰیؑ اللہ تعالٰی کے بھیجے گئے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ہیں۔ آپ کے والد کا نام "عمران" اور والدہ ماجدہ کا نام "یوکابد" تھا۔ قرآن مجید میں موسٰی علیہ السلام کا نام "موسٰی" آیا ہے جبکہ آپؑ کا لقب کلیم اللہ تھا۔بائبل میں آپ کا نام "موسیس" تحریر ہے۔پیغمبر خُدا موسی علیہ السلام کی پیدائش ایسے نازک وقت میں ہوئی جب فرعون مصر بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر دیتا تھا۔یہی وجہ موسٰی علیہ السلام کے والد کے لئے پریشان کُن تھی لیکن حضرت موسٰی کی والدہ نے ایک صندوق بنوایا اور بچے کو اللہ کے سپرد کر دیا۔صندوق شاہی محل کے کنارے کے ساتھ آکر لگا تو فرعون کے آدمیوں نے اُس صندوق کو اُٹھالیا اور بچّے کو فرعون کے دربار میں پیش کر دیا۔ فرعون نے بچّے کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو فرعون کی بیوی آسیہ نے بچّے کو قتل کرنے سے منع کیا اور فرعون سے کہا کہ یہ بچّہ ہم دونوں کی آنکھ کی ٹھنڈک ثابت ہو گا۔یُوں موسٰی علیہ السلام نے شاہی محل میں پرورش پائی۔یہ وہ زمانہ تھا جو کہ بنی اسرائیل کے زوال کا زمانہ تھا۔بنی اسرائیل کے لوگ بہت ہی ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ آپؑ ایک دن کہیں سے گزر رہے تھے کہ ایک مصری کو دیکھا جو کہ ایک اسرائیلی کو بہت بُرے طریقے سے مار رہا تھا۔ آپ کو جب اُس اسرائیلی نے مدد کے لئے پُکارا تو آپؑ آگے بڑھے اور اُس مصری کے منہ پر تھپڑ مارا جس کے نتیجے میں اُس شخص کی ہلاکت ہو گئی۔ آپؑ کا ارادہ اُس کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ آپؑ نے رّب کے حضور معافی مانگی تو اللہ تعالٰی نے آپ کو معاف کر دیا۔

نبوت کا واقعہ

موسٰی علیہ السلام نے اللہ کے حکم کے مطابق فرعون کو دعوت حق دی اور شرک، گناہ، اور ظلم و ستم نہ کرنے کی تلقین کی اور یہ مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو اب ظلم و ستم سے نجات دی جائے۔ فرعون نے کہا کہ اے موسٰی اگر تم سّچے ہو تو نبوت کی کوئی نشانی دیکھاؤ۔ موسٰی علیہ السلام نے اپنا "عصا" پھینکا تو وہ ایک اژدھا

بن گیا۔ تمام لوگ جو کہ دربار میں جمع تھے سب خوف زدہ ہوگئے۔ فرعون نے ملک کے تمام جادوگروں کو دعوت دی اور اُن کا مقابلہ حضرت موسٰی علیہ السلام سے کروایا۔ موسٰیؑ سب پر غالب ہوئے تو تمام جادوگروں نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور آپ پر ایمان لے آئے۔ فرعون کو اس بات پر بہت غصّہ آیا اور اُس نے بنی اسرائیل کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ موسٰی اور بنی اسرائیل کی جب زیادہ رسوائی ہونے لگی تو اللہ تعالٰی نے فرعون پر مختلف عذاب نازل کیے۔ جب بھی عذاب الٰہی نازل ہوتا تو فرعون حضرت موسٰی علیہ السلام سے درخواست کرتا کہ وہ دُعا کریں اور ساتھ یہ بھی کہتا کہ جیسے ہی یہ عذاب ٹل جائے گا تو میں اللہ پر ضرور ایمان لے آؤں گا۔ عذاب ختم ہوتا تو صورت حال مختلف ہو جاتی اور وہ اپنی پرانی ہٹ دھرمی پر آجاتا۔ تمام تر مایوسی اور ناکامی کے بعد حضرت موسٰیؑ نے حکمِ خُداوندی کے تحت ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ آپؑ اپنی قوم کو لے کر مصر سے فلسطین کی جانب روانہ ہوئے۔ فرعون کو اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی تو اُس نے موسٰیؑ اور اُن کی قوم کا پیچھا کرنے کے لئے ایک لشکر جرّار اکھٹا کیا۔ بنی اسرائیل کے لوگ فرعون کے طاقت ور لشکر کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ موسٰیؑ نے اُن کو تسلی دی کہ گھبرائیں نہیں اللہ کے حکم سے ہم محفوظ ہیں۔ موسٰیؑ اور بنی اسرائیل جب بحیرہ قلزم کے کنارے پہنچے تو اُس کے کنارے سے پانی ہٹا ہوا تھا تو اُس راستے پر چل دیئے۔ فرعون کا لشکر اِسی راستے کی پیروی میں آگے نکل پڑا، جب بنی اسرائیل کا ہر شخص دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تو پھر پانی اپنے اصلی روپ میں بحال ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں لشکر فرعون غرق ہوگیا اور فرعون کی لاش کو انسانیت کے لئے نشان عبرت بنادیا گیا۔

کوہ طور کا واقعہ

طور ایک پہاڑ کا نام ہے ،جس کو "جبلِ موسٰی "،"طور سینا " یا پھر کوہ سینا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مصر کی یہ وہ مشہور پہاڑی ہے کہ اِس پر اللہ تعالٰی نے حضرت موسٰی علیہ السلام کو اپنی نور کی تجلی دیکھائی۔ حضرت موسٰی علیہ السلام طور پہاڑ پر دو دفعہ گئے ،ایک اُس وقت جب موسٰیؑ وادی مقدس میں آگ کی تلاش میں نکلے اور وادی میں روشن ہونے والا شعلہ درحقیقت خُدا کے نشان کو ظاہر کر رہا تھا۔ اِس دوران موسٰیؑ کو رّب سے کلام کرنے کا شرف نصیب ہوا اور اُنہیں اللہ کی طرف سے معجزات عطا کیے گئے۔ دوسرا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب موسٰیؑ نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وجبر سے نجات دلانے کے لئے وادی سینا میں ٹھہرنا پڑا۔ یہ وہ وقت تھا جب بنی اسرائیل کو راہ راست پر لانے کے لئے موسٰیؑ کو طور پہاڑ پر بلایا گیا۔ ابتداء میں تیس راتوں کے لئے اور پھر بعد میں دس راتوں کا مزید اضافہ کیا گیا۔ چالیس دن کی تکمیل پر

موسیٰؑ کو شریعت عطا فرمائی گئی۔ موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے براہ راست مخاطب ہوئے۔ موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کے دیدار کا حد درجہ شوق ہوا اور ربّ سے اس مطالبے کی درخواست کی، اللہ کی طرف سے جواب آیا کہ اے موسیٰؑ "تم مجھ کو نہیں دیکھ سکتے" جب موسیٰؑ اپنے مطالبے پر بضد رہے تو اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ پر اپنی تجلی کو ظاہر کیا۔ جس سے موسیٰؑ بے ہوش ہو گئے، طور پہاڑ بھی تجلی کو برداشت نہ کر سکا اور سرمے کی مانند ہو گیا۔

کوہ طور سے جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو بنی اسرائیل نے اُن کی غیر موجودگی میں ایک بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا اور اُس کی پُوجا شروع کر دی۔ موسیٰؑ اس بات سخت برہم ہوئے، انہوں نے اُس بچھڑے کو نذر آتش کر دیا اور اُس کی راکھ دریا میں بہادی۔

مذہب یہودیت کے بنیادی عناصر

مذہب یہودیت کی طویل ترین تاریخ اتنے اُتار چڑھاؤ سے گزری ہے کہ اس مناسبت سے یہودیوں کے مذہبی روایات میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس لے دُرست مطالعہ کے لیے یہودیوں کی تاریخ سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔

یہودی مذہب میں نماز کا تصور

یہودیت میں تین نمازیں روزانہ کے اعمال کا دینی و مذہبی جزو ہے۔ اس طرح یہودی ایک دن میں تین نمازیں ادا کرتے ہیں۔ ہفتے کے دن اور دیگر ایام مقدسہ جیسے کہ عیدین و جشن پر یہودیوں کے فرقہ راسخ العقیدہ اور رجعت پسند لوگ ایک اضافی نماز ادا کرتے ہیں جس کو "موساف" کہا جاتا ہے۔ یہودیت میں اکثر اعمال کی قرآت باآوازِ بلند ایک خاص طرز پر کی جاتی ہے جسے "نیگون" کہا جاتا ہے۔ بیعہ یا کلیسا کا لفظ یہود و نصاریٰ دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

عید فسخ

عید فسخ یہودیوں کی ایک عید کا نام ہے جو کہ سات دن منائی جاتی ہے یہودی قوم کے مطابق اِس عید کا آغاز 15 اپریل سے ہوتا ہے۔

مقدس ایّام

مذہب یہودیت میں مقدس ایّام کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔

سبت

سبت جمعہ کے دن غروبِ آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور اگلے روز غروبِ آفتاب تک جاری رہتا ہے۔

پیساک

پیساک کا تہوار اسرائیلیوں کی مصری غلامی سے نجات کی یاد میں منایا جاتا ہے

ہفتوں کا تہوار

شیوت، عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی "ہفتوں" کے ہیں۔ یہ ایک زرعی تہوار کے طور پر شروع ہوا لیکن اس کو دیگر یہودی تہواروں کی طرح بھرپور انداز میں منایا جاتا ہے۔

سالِ نو

"روشن ہشنہ" اِس کے لفظی معنی ہے سال کا آغاز، اِس کو یہودیوں کا نیا سال بھی کہا جاتا ہے

یومِ کفارہ

یہودی کیلنڈر میں تشری کا مہینہ سب سے مقدس مہینہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ یہودیوں کا یومِ عید ہے اِس موقعے پر پچیس گھنٹے کا روزہ رکھا جاتا ہے۔

سوکوتھ

عبرانی زبان میں "سوکوتھ" کا مطلب ہے "عارضی جھونپڑا یا چھپر"۔ یومِ کفارہ کے پانچ دن بعد تشرے کی پندرہ تاریخ کا منایا جاتا ہے۔

بارمتزواہ

بارمتزواہ عیسائیت کے مقابلے میں منایا جاتا ہے۔ جب کوئی لڑکی یا لڑکا تیرہ برس کے ہو جاتے تو یہ تہوار والدین کی طرف سے منایا جاتا ہے۔ اِس موقعے پر خصوصی اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں اور اصلاحی تقاریر کی جاتی ہے۔

مذہب یہودیت میں روزہ

"یوم کپر" کے علاوہ یہودی کیلنڈر میں مزید چھے روزے شامل ہیں جن کا "تشاباؤ" کے دن کا روزہ کہا

جاتا ہے۔

یہودی مذہب کی تعلیمات

ہر مذہب کی طرح یہودی مذہب کی اپنی تعلیمات ہیں جن پر اُن کے مذہب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

یہودی مذہب میں خُدا کا تصور

عبرانیوں میں خُدا کے بارے میں مختلف عقائد و نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض قدیم روایت سے جوڑے ہوئے یہودیوں کے عقائد کے مطابق اللہ ایک ہے اور وہ تمام جہانوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ بعض یہودیوں کا خُدا کا ماننا کچھ یُوں ہے کہ ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوب علیہ السلام کا جو خُدا ہے وہی اسرائیلوں کے قومی خُداؤں میں سے ہے۔ بعض جدید نظریات اور فکر کے حامل یہودیوں کا یہ نظریہ ہے کہ خُدا ایک قوت ہے یا اس کی کوئی مثل ہے۔ یہودیوں میں خالص توحید و تصّورات کے بارے پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم لکھتے ہیں۔

> "خالص توحید کا تصّور پیدا ہونے سے پہلے یہودی کثرت پسند تھے اور یہ حالت حزقیاہ کے زمانے تک برقرار رہی، چھٹی صدی ق م میں مقولہ عام تھا، اے یہود جتنے تیرے شہر ہیں، اتنے تیرے معبود ہیں"۔ (۳)

مذاہب کے اندر جو بات دیکھنے کو ملتی ہے، خاص کر اُن مذاہب میں جو دیوی دیوتا کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ مختلف دیوی دیوتا کی پُوجا کرتے ہیں تو اُن میں سے ایک کو زیادہ مقام اور رُتبہ دیتے ہیں۔ اسی طرح اسرائیلی (یہودی) مذاہب میں بھی عبرانی عورت کی سب سے بڑی خواہش ماں بننے کی ہوتی ہے۔ ابتداء میں ہی یہوواہ کی عبادت میں گہرائی پیدا ہونے لگی تھی۔ یہوواہ عبرانی زبان میں خُدا کو کہتے ہیں اس کو یہواہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہوواہ کی عبادت کے باوجود دوسرے معبود بھی موجود تھے۔ لیکن یُوں یہوواہ کو اپنا معبود ماننے والوں میں اور دوسرے معبودوں کی پُوجا کرنے والوں میں اندرونی سطح پر اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے اور اس تمام تر صورتِ حال میں یہوواہ کو کامیابی نصیب ہوئی اور باقی تمام تر معبودوں کو محض بُت تصّور کیا جانے لگا۔

> "حضرت ابراہیمؑ نے توحید کا درس دیا اور ایک خُدائے واحد پر ایمان لانے کی تلقین کی تھی، اُس زمانے میں خُدا کو ایل یا ایلوھم کہا جاتا تھا، بعد میں یہودیوں نے بُت پرستی اختیار کرلی اور "لعل" بُت کو پُوجنے لگے۔ لعل زراعت و زرخیزی کا بُت تھا، حضرت موسٰیؑ نے توحید کی دعوت دی اور یہوواہ کی پرستش کی تلقین کی، یہودی خدا کو یہواہ کہتے ہیں، یہواہ خُدائے واحدہ ہے، جو صاحب عظمت و جلال و جبروت ہے، یہودیت

کے تصوّر خُدا میں ایک مطلق العنان بادشاہ کا تصوّر جھلکتا ہے"۔(۴)

عہد نامہ عتیق جو کہ یہودیوں کی مقدس کتاب ہے اُس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیسوں مرتبہ تذکرہ آیا ہے، لیکن جو سب سے زیادہ جس نام کو عظمت اور فضیلت دی گئی ہے وہ لفظ یہواہ ہے۔ یہ لفظ بائبل میں بھی ۸۲۳ مرتبہ آیا ہے۔

مقدس کتابیں

یہودی مذہب کے پیروکار کسی بھی ایک کتاب کو مقدس کتاب کے طور پر نہیں مانتے بلکہ مختلف صحیفے اور مختلف کتابیں ہیں جن کو وہ تسلیم کرتے ہیں۔

بائیبل

بائیبل کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے ایک وہ زمانہ جو کہ زمانہ قدیم سے تعلق رکھتا ہے اور ایک جدید زمانہ ہے۔ قدیم عہد کا زمانہ عمومی طور پر تین حصّوں پر مشتمل ہے۔

توریت

یہ کتاب اسفار خمسہ یہودیت کی مرکزی کتاب ہے، آج کے دور کی بائیبل میں پرانے عہد کی پہلی پانچ کتابوں کو توریت کہتے ہیں۔

> "توریت یا پہلی پانچ کتابیں جو بالترتیب کتاب پیدائش، کتاب خروج، کتابِ احبار، کتاب گنتی اور کتاب استثناء پر مشتمل ہیں، پورے عہد نامہ قدیم میں یہ سب سے زیادہ مقدس اور اہم سمجھی جاتی ہیں، اور حضرت موسیٰؑ کی لائی شریعت انہیں میں مذکور ہے"(۵)

ان پانچ مقدس کتابوں میں یہودی مذہب کے حوالے سے مختلف مواد موجود ہے۔ جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

کتابِ پیدائش

عربی زبان میں اس کے لئے "تکوین" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت آدمؑ کے بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان ہونے والی کشمکش کا ذکر اس میں درج ہے۔ طوفان نوحؑ اور یوسفؑ کے قصّے اس کتاب میں موجود ہیں۔

کتابِ خروج

اس کتاب میں حضرت موسیٰؑ کے جبل طور پر جانے کے واقعات کا ذکر موجود ہے اور اُن کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ موجود ہے۔

کتابِ اَحبار

"احبار" کے لفظی معانی "علماء" ہیں۔اس کتاب میں بنی اسرائیل کے شرعی اور فقہی احکامات کا ذکر موجود ہے۔اس کے علاوہ معاشرتی مسائل کو بھی اس کتاب میں اُجاگر کیا گیا ہے۔

کتابِ گنتی / اعداد

اس میں یہودی قبائل کی تعداد، کوہ سینا کے واقعات، بنی اسرائیل قوم کا نسب، تاریخ وحالات کا ذکر ملتا ہے۔

صحائف مقدسہ

ان کی تعداد بارہ ہے جن میں زکریا، ملاکی، نحوم، اور یونس وغیرہ شامل ہیں۔

کتابِ استثناء

استثناء کا معنی ہے دہرانا، اُس کا اعادہ کرنا، اُس میں دوسری اور تیسری کتاب کے قوانین کو دُہرایا گیا ہے۔اس کے علاوہ احکام عشرہ کا ذکر بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔

صحائف انبیاؑ

اس صحائف انبیاء کی تعداد بائیس (۲۲) ہے جن میں قضاۃ، ایوب، دانیال، زبور، سلیمان، تواریخ اوّل، تواریخ دوم وغیرہ شامل ہیں۔

تلمود / تالمو

تلمود عبرانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہے سکھانا، تعلیم دینا، اور تعلیم حاصل کرنا، بعض روایات میں لکھا گیا ہے کہ تلمود کی جو بھی روایات ہیں وہ روزِ ازل سے ہے، اس میں جو بھی تحریر کیا گیا ہے وہ یہوواہ یعنی اللہ تعالیٰ کا اولین فیصلہ ہے۔ جس کی تکمیل واجب ہے۔اس کتاب میں معاملات زندگی، قصاص، عقائد کے احکامات و معاملات شامل ہیں۔یہودی علماء کا یہ مشترکہ فیصلہ ہے کہ جو یہودی اس کتاب پر عمل نہیں کرے

گا، وہ یہواہ کے غصّے کا حقدار ہے۔

یوم آخرت

یہودی مذہب کے لوگ یوم آخرت کے قائل تھے، اس کائنات کو ختم ہونا ہے اور ہم سب کو اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔

حقوق العباد

حضرت موسٰی علیہ السلام کے احکام عشرہ میں بندوں کے حقوق کے متعلق بہت عمدہ تعلیمات دی گئی ہیں۔ جس میں عورت کا حق، تعداد ازواج، حق مہر، طلاق، اولاد کے حقوق، طہارت، مے نوشی، سود، اور قیدیوں کے حقوق وغیرہ شامل ہیں۔

یہودیت اور تصّوف

اکثر لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہودیت اپنے مزاج کے اعتبار سے مادیت پرستی پر زیادہ زور دیتی ہے۔ تصّوف کا عمل ہر مذہب میں موجود ہے۔ اہل اللہ حقیقت میں وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے ریاضتوں اور مختلف مجاہدوں سے گزرنے کے بعد حقیقت کو تلاش کیا ہوتا ہے۔ متصوفانہ فکر اور سوچ یہودی مذہب میں بھی ابتداء ہی سے رہا لیکن اس کا جھکاؤ زیادہ شخصی تجربات پر ہی رہا۔ دوسرے بین الاقوامی مذاہب کی طرح یہودی تصّوف اس لحاظ سے بھی مختلف اور منفرد ہے کہ اس میں شریعت، تصّوف میں نظریاتی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ زبور اور تورات کی کتاب میں بھی انبیاؑ کے تصّوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ یسعیاہؑ اور حزقی ایلؑ کی روحانیت میں ایک طرف حقیقت اولٰی ظاہر ہو رہی ہے تو دوسری جانب اللہ کی رضا کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے یہ بہترین ذریعہ ہیں۔ اس حوالے سے عہد نامہ باب ۱۳۱ میں یہ درج ہے کہ:

"اے خُداوند تُو میرا اُٹھنا بیٹھنا جانتا ہے تُو نے مجھے آگے پیچھے سے گھیر رکھا ہے
تیرا ہاتھ مجھ پر ہے، یہ عرفان میرے لئے نہایت عجیب ہے"۔[۶]

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد نامہ عتیق میں یہودی مذہب میں داخلی سطح پر ہی متصوفانہ رجحانات بدرجہ اتم موجود تھے۔ جو کہ قُرب خُداوندی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ تھے۔ یہودی مذہب میں تصّوف کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اہم نام "حکیم فیلو" کا ہے۔ فیلو نے یہودی تصّوف کو اور یونانی فلسفہ کو مشترک کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح "ہر کلتیس" نے یہودی تصّوف میں کلمہ میں نیم فلسفیانہ اور اس

میں نیم متصوفانہ رنگ کو پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ "ہر کلتیس" نے کلمہ کو حقیقت واحدہ اور حقیقت اولیٰ کے طور پر ظاہر کیا ہے۔ یہودی صوفیاء باقاعدہ خانقاہیں، حلقے، اور مختلف زوایے بناتے رہے ہیں۔ لہذا یہ بات غلط ہے کہ یہودی تصّوف میں خانقاہی نظام موجود ہی نہیں۔ یہودی بھی روحانی علوم کے قائل تھے۔

"دوسرے مذاہب کے صوفیاء کی طرح اُنہوں (یہودیوں) نے بھی اپنے حلقے اور سلسلے بنائے ہوئے تھے۔ جہاں یہ خفیہ علم و عرفان صرف چند لوگوں تک محدود رہتا تھا"۔[۷]

یہودیوں میں پیر و پرشد اور آگے مریدین والا سلسلہ بھی اُن کے مذہب میں موجود تھا۔ یہودی لوگ متصوفانہ فکر کی بدولت علم نجوم اور اُس کے اثرات کو بھی مانتے تھے۔ یہودی تصّوف میں خُدا کا تصور ایک رحمن اور رحیم کے کردار کے بجائے قہار و جبار کی صفات سے جوڑا ہوا دیکھائی دیتا ہے۔

منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر یہودیت کے حوالے سے

ناول منطق الطیر جدید آج کے دور کا ایک ایسا ناول ہے کہ جس میں مذاہب عالم کو تصّوف کے حوالے سے موضوع بنایا گیا ہے۔ یہودی مذہب ایک الہامی مذہب ہے اور اس کا شمار دُنیا کے قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے۔ یہودیت کے اندر تصّوف کا مکمل پرچار ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر اس ناول منطق الطیر جدید میں بھی مصنف نے دو چیزوں کو احاطہ تحریر کیا ہے۔ ایک تصّوف اور دوسرا مذہبی روایات، یہودی مذہب میں یہ دونوں چیزیں ابتداء سے ہیں۔ ناول میں مستنصر حسین تارڑ نے سات پرندوں کا ذکر کیا ہے، جو کہ اپنے مذہب کی نمائندگی کرتے ہوئے ٹلہ جوگیاں پہاڑ کی سمت بڑھتے ہیں۔ یہودی مذہب کا پرندہ وہ پرندہ ہے جو طور پہاڑ سے پرواز کرتا ہوا ٹلہ جوگیاں کی پہاڑی کی طرف سفر کرتا ہے۔ اُس کی یہ پرواز سچائی کی تلاش میں ہوتی ہے اور وہ باقی مذاہب کے پرندوں کے ساتھ مل کر اپنی منزل ٹلہ جوگیاں کی جانب بڑھتا ہے۔ ناول کے ابتدائی باب میں ہی مصنف نے طور پہاڑ کا تذکرہ کچھ یُوں کیا ہے۔

"یہ عام سا ٹیلہ، جہلم کی وادی میں سے تقریباً تین ہزار دو سو فٹ کی بلندی تک پہنچتا آخر کیوں اتنا برگزیدہ ٹھہرا کہ یہ نہ تو کوہ طور تھا، نہ ہی یروشلم کی کوئی پہاڑی اور نہ کوئی جبل نور تھا اور اس کے باوجود اس کے اندر ایسی کون سی الوہی کشش تھی کہ جن لوگوں کے اندر عشق آتش بھڑکتی تھی، آسمانوں پر جاتی عرشوں کو سلگاتی تھی

وہ اس کی جانب یُوں کھنچے چلے آئے۔ بے اختیار اس کی کوہ نوردی کی، جیسے لوہے کے
ذرّے ایک مقناطیس کی جانب ایک بے بسی کے حالت میں لُڑھکتے چلے آتے ہیں"۔[۸]

جہلم کا ٹلہ جوگیاں ایک تاریخی جگہ ہے جس کی بنیاد ایک گیانی گورکھ ناتھ نے دو ہزار سال پہلے رکھی تھی۔ ٹلہ جوگیاں کی تاریخی اہمّیت کچھ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ جہاں پر مختلف ادوار میں جوگیوں نے بسیرا کیا اور اس جگہ پر قیام کیا۔ ٹلہ جوگیاں پہاڑ کی طرح طور پہاڑ بھی ہے جس کو جبل موسیٰؑ ہے جس کو کوہِ سینا کہا جاتا ہے۔ یہ ملک مصر کی وہ مشہور پہاڑی ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے نور کی تجلی دیکھائی تھی۔ یُوں تاریخی لحاظ سے طور کا پہاڑ بہت اہمیّت کا حامل ہے۔ اسی طرح یروشلم کی کی تاریخ کو پرکھا جائے تو یہ وہ مقام ہے کہ جس کو تینوں الہامی مذاہب میں جن میں یہودیت، مسیحوں اور مسلمانوں کے نزدیک یہ بہت ہی مقدس جگہ ہے۔ حضرت سلیمانؑ کا تعمیر کردہ معبد ہے جو کہ بنی اسرائیل کے نبیوں کا قبلہ تھا۔ قبلہ کی تبدیلی سے پہلے مسلمان اس کی جانب منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ مکہ مکرمہ سے القدس تک کا فاصلہ ۱۳۰۰ کلو میٹر ہے۔ چوتھا اہم پہاڑ جبلِ نور ہے جو کہ مکہ معظمہ سے مشرق کی جانب ساڑھے چار کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس پہاڑ کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس ہی پہاڑ میں غار حرا ہے۔ اس غار میں بعثت سے قبل رسول پاک ﷺ عبادت کیا کرتے تھے۔ پہلی وحی بھی اسی پہاڑ پر نازل ہوئی۔ یوں یہ چاروں پہاڑ تاریخی اعتبار سے بہت پُرانے ہیں لیکن ٹلہ جوگیاں کا پہاڑ ایک عام سا پہاڑ ہے۔ اس کی اہمّیت ویسی نہیں ہے جیسی طور کے پہاڑ کی ہے، یروشلم کی پہاڑی کی ہے یا جیسے جبلِ نور کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ٹلہ جوگیاں کا پہاڑ کیوں اتنا اہم ٹھہرا کہ جس کے من میں عشق کی آگ بھڑکتی تھی وہ اس پہاڑ کی سمت رختِ سفر باندھ لیتا تھا۔ وہ دیوانہ وار ٹلہ جوگیاں پہاڑ کی جانب سفر کرتا۔ اسی طرح ایک اور جگہ پر مصنف نے طور پہاڑ کا ذکر اپنے الفاظ میں کچھ ایسے بیان کیا ہے۔

"بے شک حلاج ٹلہ جوگیاں پر نہ چڑھا، صلیب پر چڑھایا گیا کہ اُس کے لئے وہی ٹلہ جوگیاں کا ایک مظہر تھا، اور نہ خاتون عجم اس کوہ پر بلند ہوئی کہ اُسے تو بہاؤ اللہ کے عشق میں بلند نہیں ہونا تھا۔ ایک تاریک کنویں میں گرتے جانا تھا، پر عشق کے ہاتھی کے روندے ہوئے جتنے بھی ہوتے ہیں، وہ ٹلّے کے راستے میں پڑتے ہر پتّھر کے مسام میں سانس لیتے ہیں، ہر جھاڑی کی گھناوٹ میں اُن کی موجودگی وہی آگ روشن ہوتی ہے جو کبھی کوہ طور کی بلندی پر ظاہر ہوئی تھی"۔[۹]

عشق کے راستے پر بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن جن پر عشق اللہ غالب آجاتا ہے تو وہ پھر مشکلات کو اہمّیت نہیں دیتے بلکہ اُن مشکلات کو خوشی خوشی گلے لگاتے ہیں۔ اُن کے لئے ہر مشکل مرحلے میں ایک نئی سانس اور ایک نئی زندگی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ تکالیف اور مشکلات پر حاوی ہوتے ہیں اور اُن کے من میں وہی شمع روشن ہوتی ہے جو طور پہاڑ پر اُس وقت ظاہر ہوئی تھی جب موسیٰؑ اللہ کا دیدار کرنے کے لئے طور پہاڑ کی چوٹی پر گئے تھے۔ یہی روشنی منصور حلاج کے من میں بھی روشن ہوئی تو اُس نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا۔ منصور حلاج تصّوف کی راہ کا مسافر تھا جیسے ٹلہ جوگیاں پہاڑ کے مسافر تھے لیکن منصور حلاج باقی جوگیوں کی طرح ٹلہ جوگیاں پہاڑ کے اوپر تو نہ چڑھا لیکن حق و صداقت کو گلے لگا کر سولی پر چڑھ گیا۔ اُس کے لئے وہی سچّ اور حقیقت کا راستہ تھا۔ تصّوف کی دُنیا میں ایک بہت ہی معتبر نام فارسی کی شاعرہ قراۃ العین طاہرہ کا تھا۔ قراۃ العین طاہرہ بہاؤاللہ کی تعلیمات کی بہت بڑی مبلغ تھی۔ بہاؤاللہ نے اُن کو "طاہرہ کا لقب دیا تھا۔ قراۃ العین طاہرہ کو خاتون عجم بھی کہا جاتا ہے، جنہوں نے اپنے گھر کی سکون والی زندگی کو خیر آباد کہا اور شہر شہر اپنے مذہب کی تبلیغ کی اور بہت سے لوگوں کو اپنے نظریات سے آگاہ کیا۔ قلندرانہ زندگی بسر کی، متصوفانہ فکر لیے لوگوں کو دعوتِ دین دی۔ بغاوت دین کو جواز بنا کر اُن کو ایران کے بادشاہ ناصر الدین قاچار نے اپنے دربار میں بلوایا تُو طاہرہ نے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا کہ اے بادشاہ تیرے پاس ملک، جاہ، اور بادشاہی ہے تو میرے پاس قلندرانہ اطوار ہیں، اگر تمھاری چیز اچھی ہے تو تمہیں مبارک ہو لیکن اگر میری چیز بُری ہے تُو مجھے قبول ہو۔ اس کے بعد بادشاہ نے اُن کو قتل کرنے کی ٹھان لی اور اُنہیں قصر شاہی ایک باغ میں لے جا کر کنویں میں دھکیل دیا گیا اور کنویں کو پتھروں سے بھر دیا گیا۔

> "وہ جو دس احکام طور کی چٹانی تختیوں پر اُس کی لکھنے والی اُنگلی سے ثبت کردہ، اپنے دونوں بازوؤں میں حمائل کیے، اُس سے ہم کلامی کے بعد، منتظر بنو اسرائیل پر اُترے تھے تو کیا وہ احکام بدل گئے ہیں جو یُوں ایک اور کوہ پر چڑھتے جارے ہو، شاید تم شک و شبے کے گورکھ دھندوں میں الجھ گئے ہو کہ وہ دس آسمانی احکام آج کی دُنیا میں دو ہزار برس بعد لاگو نہیں ہو سکتے"۔[۱۰]

موسوی شریعت میں بنی اسرائیل قوم کو دس ابتدائی ہدایات دی گئی تھی جن کو احکامات عشرہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ احکامات تھے جو کہ یہودی مذہب کے لوگوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھے۔ جن کو وہ پتھر کی سِلوں پر کندہ کر کے لائے تھے۔ یہ دس احکامات توریت کی دوسری کتاب خروج کے

بیسویں باب میں درج ہیں۔ یہ دس احکامات ایسے ہیں کہ جو ایک کامل زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ وہ دس احکامات یہ تھے کے خُدا کے علاوہ کسی کو معبود نہ ماننا، کوئی بُت نہ تراشنا، کسی غیر کے آگے سجدہ نہ کرنا، خُدا کا نام بُری نیت سے نہ لینا، سبت (ہفتے) کے دن اللہ کو یاد کرنا، اپنے ماں اور باپ کی عزت کرنا، کسی کا خون نہ کرنا، زنا نہ کرنا، چوری نہ کرنا، اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا۔ یہ وہ دس احکامات تھے جن کے ذریعے موسوی شریعت کی بنیاد رکھی گئ اور یہ وہ احکامات تھے جو کہ طور پہاڑ موسٰی علیہ السلام کو اللہ سے ہم کلام ہونے کے بعد ملے لیکن یہ آسمانی احکامات آج اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود لوگ ان کو اپنے اوپر لاگو نہ کر سکے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ انسان سارا کچھ ملنے اور سمجھنے کے باوجود بے چینی کے عالم میں ہے۔ انسان شکوک وشبہات کی زندگی اور اضطراب والی زندگی بسر کر رہا ہے اور مزید سچّائی کا سراغ لگانے کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

> "اُن میں وہ جھلسا ہُوا پرندہ بھی تھا جو کب سے طُور کی سلگتی جھاڑی کے اندر گھونسلا بنائے بیٹھا تھا، اُس جھاڑی کا بیج کہیں آسمانوں سے گرا، طور کی مٹی میں دفن ہو کر پھوٹا اور پھر عشق کی آگ کی تپش میں سلگنے لگا، شاید وہ پرندہ اپنی مختصر حیات کے دن اُسی جھاڑی کی سلگاہٹ کو برداشت کرتے ہوئے بسر کر جاتا ہے پر طور کے دامن میں سے ایک چرواہا اپنا عصا ٹپکتا آیا اور اُس جھاڑی میں ایسی آگ روشن ہوئی کہ اُس کے بال وپر جلنے لگے، وہ فرار پر مجبور ہو گیا، پرواز کے دوران اُس نے بہت مدھم آہستگی اختیار کی کہیں اُس کے سلگتے ہوئے بال وپر بھڑک کر اُس کے وجود کو راکھ نہ کر دیں"۔[11]

حقیقت اور سچّائی کی تلاش میں سات پرندے جب ٹلہ جوگیاں کا سفر کرتے ہیں تو اُن میں سے ایک پرندہ وہ بھی تھا جس کا مسکن طور کا پہاڑ تھا۔ یہ پرندہ طور پہاڑ کی ایک ایسی جھاڑی پر رہتا تھا کہ جس جھاڑی کا بیج آسمان کی بلندیوں سے کوہ طور پر گرا، کوہ طور کی مٹی میں اُس بیج کو بویا گیا پھر وہ ایک جھاڑی کی صورت میں نمودار ہوا جس کو اس پرندے نے اپنا ٹھکانہ بنایا۔ وہ پرندہ طور پہاڑ پر خوش تھا اور وہ عشق کی آتش میں سلگتے ہوئے شاید اپنی تمام تر زندگی کوہ طور پر ہی بسر کر دیتا مگر اللہ تعالٰی نے حضرت موسٰی علیہ السلام کو ملاقات کے لئے طور کے پہاڑ پر بلایا جب حضرت موسٰی علیہ السلام اپنے محبوب رّب کا دیدار کرنے کے لئے اپنا عصا لیے کوہ طور پر پہنچے تو رّب کائنات طور کی بلندیوں پر جلوہ گر ہوا۔ طور کا پہاڑ اللہ تعالٰی کے جلال کی تاب نہ لا سکا اور جل کر راکھ ہو گیا۔ چونکہ اُس پرندے کا مسکن بھی طور کا پہاڑ تھا اس لئے وہ بھی جُھلس گیا تھا، لہذا وہ بھی مائل پرواز

ہوا اور ٹلہ جوگیاں کی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ اُس نے اُڑتے وقت اپنی اُڑان کی رفتار بہت آہستہ رکھی اُس کے جسم میں سلگتی ہوئی آگ کہیں بھڑک نہ اُٹھے اور اُس کے سلگتے ہوئے اعضاء اُس کے وجود کو جلا کر راکھ نہ کر دیں۔

"موسٰے حسین کے دماغ کے ایک ایسے خلیے نے سوچ کے ایک جھرنے کو جنم دیا جس میں ابھی تک مستعار شدہ بُھس نہیں بھرا تھا کہ۔۔۔۔۔۔ یہ فتور ہے۔۔۔۔۔ بھلا کوہ طور کے دامن میں سونے کے زیورات پگھلا کر تخلیق کردہ سنہری بچھڑا ٹلہ جوگیاں کی چڑھائی کے دوران میرے سامنے کیسے آسکتا ہے۔۔۔۔۔۔ اگر آگیا تو یہ بھی شناخت کی بھول بھلیوں میں الجھ کر مجھے وہ موسٰے سمجھ رہا ہے، جو ابھی ابھی کوہ طور سے اُترا ہے۔۔۔۔۔۔ اُسے شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں وہ موسٰے نہیں ہوں اور میں بھی وہ سنہری بچھڑا نہیں ہوں لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ موسٰے اور سنہری بچھڑے کے روپ بدلتے رہتے ہیں"۔ (۱۲)

سنائی باتوں کو قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ دوسروں کے خیالات و نظریات کو من و عن تسلیم کرنے والا انسان نہیں تھا۔ وہ ذاتی مشاہدات اور عقل سلیم پر یقین رکھتا تھا اور ہر چیز کو اُس کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔ اُس نے یہ سب کچھ فتنہ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ صدیوں پہلے کوہ طور کے دامن میں سونے کو پگھلا کر بنایا گیا وہ بچھڑا آج ٹلہ جوگیاں کے پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اُس کے سامنے آگیا ہے، زمان و مکان کا اتنا بڑا فرق آخر کیسے ختم ہو سکتا ہے اور اگر فرض کر بھی لیا جائے کہ یہ وہی بچھڑا ہے تو اُس نے یقیناً غلط شخص کا انتخاب کیا ہے۔ یہ بچھڑا غلط فہمی کا شکار ہو کر مجھے وہ موسٰے سمجھ رہا ہے جو ابھی ابھی کوہ طور پر اپنے رّب سے ملاقات کر کے اُترا ہے۔ اِس کو مغالطہ ہوا ہے۔ میں ہرگز وہ موسٰی نہیں ہوں۔ اس پر وہ بچھڑا گویا ہوا کہ وہ بھی کوہ طور والا بچھڑا نہیں ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موسٰے اور سنہری بچھڑے اپنی شکل و صورت بدلتے رہتے ہیں۔ ہر دور میں سّچائی اور حق کی تلاش کے لئے کوئی نہ کوئی موسٰی آتا رہتا ہے اور ہر دور کی گمراہی اور جہالت بھی بچھڑوں کے روپ میں نمودار ہوتی رہتی ہے۔

"گڈریے نے اپنے عصا سے سرکنڈوں کو چھوا، تو اُن کے درمیان ایک راستہ کشادہ ہوتا چلا گیا۔ سرکنڈے جو ابھی ٹھاٹھیں مارتے ایک سمندر کی مانند راستے میں حائل تھے، سمٹتے گئے اور اُن کے بیچ میں سے ایک پگڈنڈی نمودار ہوتی چلی گئی"۔ (۱۳)

یہاں پر موسےٰ حسین ٹلہ جوگیاں کے پہاڑ پر چڑھتے ہوئے راستے میں ملنے والے اشخاص کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُسے راستے میں ایک گڈریا ملا جو کہ وہاں کا رہائشی لگتا تھا، موسےٰ حسین نے اُس سے پوُچھا کہ وہ بھٹک گیا ہے اور اُس اُوپر جانے کے لئے مطلوبہ راستہ نہیں مل رہا ہے اور وہ اِن سرکنڈوں میں الجھ گیا ہے۔ سرکنڈوں کی دیوار اُس کی راہ میں حائل ہو گئی ہے۔ اس پر گڈریے نے اپنی لاٹھی سے اُن سرکنڈوں کو ہلایا تو اُن سرکنڈوں کے بیچوں بیچ ایک بہت وسیع راستہ بنتا گیا۔ وہ سرکنڈے جو ایک سمندر کی طرح اُس کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ وہ حیرت انگیز طور پر اُس کی راہ سے غائب ہوتے گئے اور اُن کے درمیان میں ایک وسیع و عریض اور ہموار راستہ بنتا گیا۔ یہاں پر گڈریے کی مثال کے ذریعے حضرت موسٰیؑ کے اُس مشہور واقعے کا حوالہ دیا گیا ہے کہ جب وہ فرعون کے ظلم سے بنی اسرائیل قوم کو بچا کر مصر سے نقل مکانی کر رہے تھے تو فرعون کے لشکر نے اُن کا پیچھا کیا۔ راستے میں ایک طرف سمندر تھا تو دوسری جانب فرعون کا لشکر۔ بنی اسرائیل کے لوگ فرعون کے لشکر کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ اس پر موسٰی علیہ السلام نے کہا کہ گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ نے حکم دیا کہ اے موسٰیؑ اپنا عصا سمندر کے کنارے پر مارو، جس سے دریا دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ درمیان میں ایک ہموار راستہ بن گیا، جس پر چل کر بنی اسرائیل نے دریا عبور کیا۔ جب فرعون اور اُس کی فوج بھی اُسی راستے پر چل کر دریا عبور کرنے کی کوشش کی تو اللہ کے حکم سے دریا دوبارہ آپس میں مل گیا اور فرعون اپنے لشکر کے ساتھ بحیرہ قلزم میں غرق ہو گیا۔

> "میں نے تم سے شکایتیں کرنی ہیں کہ تمہاری جستجو کی پاداش میرے بال و پر جل اُٹھے، کوہ طور پر اگر ہر شب ایک الاؤ جلتا دیکھائی دیتا تھا تو تمہیں کیا تکلیف تھی کہ تم اپنی بھیڑوں اور اہلیہ کو ترک کرکے اپنا عصا تھام کر اُس کی کھوج میں چل نکلے۔۔۔۔۔ آرام سے اپنے جھونپڑے میں قیام کیوں نہ کیا کہ وہ الاؤ تو تب سے سلگتا تھا جب سے یہ کائنات وجود میں آئی تھی، اُسے سلگنے دیتے، تب تک میں اُس جھاڑی کے دامن میں اپنے بال و پر سلامت رکھے اپنے گھونسلے میں چین سے تھا۔ پھر تم چلے آئے ہم کلام ہونے کے لئے تو وہ جھاڑی یُوں بھڑک اُٹھی کہ میں اُس کے شعلوں کی زد میں آکر اپنے بال و پر جلا بیٹھا تھا، گویا اپاہج ہو گیا صرف تمہاری مداخلت کی وجہ سے۔۔۔۔ اور اب میرے جھلسے ہوئے پَر پرواز کے دوران ایک اپاہج فقیر کی مانند آسمانوں کی گلیوں میں گھسٹتے پھرتے ہیں۔۔۔۔ میں دیگر پرندوں کی مانند ناک

کی سیدھ میں نہیں اُڑ سکتا، کبھی دائیں جانب لڑھکتا جاتا ہوں اور کبھی بائیں جانب ایک بے سُدھ پتنگ کی مانند ڈولتا جا رہا ہوں۔ اپنی راہ سے بھٹک جاتا ہوں۔۔۔۔ مجھے تم سے بہت شکائیتں ہیں۔۔۔ موسٰے۔۔۔۔ میں اچھا بھلا پرندہ تھا، تم نے مجھے اپاہج کر دیا۔۔۔۔ تم جانتے ہو ناں کہ میں تب سے تھا، جب آغاز ہوا تھا"۔[۱۴]

ٹلہ جوگیاں کی جانب سفر کرتے ہوئے طور پہاڑ کے جُھلسے ہوئے پرندے نے حضرت موسٰی علیہ السلام سے شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں تمھارے تجسس کا شکار ہوا ہوں نہ تم اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کوہ طور پر چڑھتے اور نہ ہی میرے بال و پر جلتے کوہ طور پر موجود آگ کو دیکھ کر تمھیں کیا ہو گیا تھا کہ تم نے اپنا گھر بار اور اپنے مال مویشی چھوڑ دیئے، تم نے اپنا عصا لیا اور اُس آگ کی حقیقت کو تلاش کرنے چل نکلے تم کو تو سکون سے اپنی جھونپڑی میں بیٹھنا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ آگ تو روز ازل سے جل رہی تھی تم اُسے جلنے دیتے تمہارا کیا جاتا تھا۔ اُس وقت تک میں اُس جھاڑی میں خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا، میرا گھر محفوظ تھا، لیکن تم اللہ تعالٰی سے ملاقات کرنے چلے آئے۔ تمہارے آنے سے جھاڑی میں اس شدتّ سے آگ لگی کہ میں پُورے کا پُورا جھلس گیا، میں بالکل معذور ہو گیا، صرف اور صرف تمھاری وجہ سے اور اب میں ایک معذور فقیر کی مانند ملک کی گلیوں میں اپنے جلے ہوئے وجود کو گھسیٹتا پھرتا ہوں، میں دوسرے پرندوں کی طرح اُڑ نہیں سکتا کبھی میں دائیں جانب گرتا ہوں کبھی بائیں جانب اور ایک کٹی پتنگ کی طرح آسمان کی بلندیوں میں لڑھکتا رہتا ہوں۔ میں بالکل ٹھیک تھا لیکن تم نے موسٰیؑ مجھے معذور کر دیا۔ حالانکہ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اُس وقت سے کوہ طور پر موجود ہوں جب سے یہ کائنات بنی ہے۔ سچائی اور وحدانیت تو روز ازل سے چلتی آ رہی ہے اور برقرار رہے گی۔

"تمہاری جستجو نے مجھے بھی جلا ڈالا۔۔۔ تم اُس پہاڑ کے دامن میں پھیلے صحرا میں ۔۔۔ اپنے اُس مصر سے تم کو کبھی فرعون کے لاڈلے اور آسیہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے، جب دھتکارے گئے کہ جاؤ اس لق ودق صحرا کے دوزخ میں اور اس میں جتنے بھی بچھو، چھپکلیاں، سانپ اور رینگنے والے ہیں، اُن پر حکومت کرو، اپنے عصا سے اُنہیں مطیع کرو اور ایک بزرگ اور برتر شعیب نام کے شخص نے اپنی بیٹی صفورہ تم سے بیاہ دی اور تم اُن کی بھیڑیں چراتے ایک صحرائی حیات بسر کرتے تھے، تو پھر کیوں ایک جذب اور وارفتگی کی کیفیت نے تمہیں مغلوب کیا، جستجو کے ہاتھوں مجبور

ہوئے،اس پہاڑ کی چوٹی پر ہر شب جو روشنی تمہیں دیکھائی دیتی تھی اور دیگر صحرا نشین اس یقین کے اسیر تھے کہ یہ رب کی روشنی ہے اُس کی کھوج میں کوہ پیمائی اختیار کی اور جونہی تم نے چوٹی پر قدم رکھا تو خُدا تم سے ہم کلام ہوا۔۔۔نور سے نور ونور جھاڑی میں سے اُس نے تم سے کلام کیا اور تم۔۔۔۔چونکہ یہ زمیں مقدس تھی،اپنے پٹھے ہوئے جوتے اُتار کر جھاڑی کے آگے سجدہ ریز ہوگئے اور وہ بھڑک اُٹھی ۔۔۔یوں کہ میرے بال وپر بھی سُلگ اُٹھے اور میں اُڑان کے قابل اتنا نہ رہا۔۔۔تو اے موسےٰ اگر آج میں ایک مرتبہ پھر سچّ کی تلاش میں طُور سے اُڑان کر کے قاف کے پہاڑ کی جانب نہیں،جوگیوں کے اس پہاڑ کی جانب چلا آیا ہوں تو یہاں بھی تم ہی موجود ہو۔میں نے اس لئے طُور کو ترک کیا کہ وہ جھاڑی کب کی سرد ہو چکی ہے،اُس کی آگ بجھ چکی ہے۔اور یہاں پھر موجود ہو"۔[۱۵]

طور کا جُھلسا ہوا پرندہ شکایت آمیز لہجے میں مزید گویا ہوا کہ اے موسیٰؑ تمہاری تلاش اور تمھارے تجسس نے مجھے تباہ کر دیا ہے مجھ سے میرا ٹھکانہ چھین لیا گیا ہے۔تم تو کوہ طور کے نیچے موجود صحرا میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔تم مصر سے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم سے بچا کر اس صحرا میں لائے تھے۔مصر میں تو تم فرعون کے عزیز بیٹے اور اُس کی بیوی آسیہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور تارا تھے،لیکن جیسے ہی اُسے تمہاری بغاوت کا علم ہوا تو اُس نے تمھیں اپنے محل سے نکال دیا،تا کہ یہاں موجود سانپوں،بچھوؤں،چھپکلیوں اور تمام کیڑوں پر حکمرانی کرو اور اُنہیں اپنا مطیع اور فرمابردار بناؤ اور پھر اللہ کے پاک پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام نے آپؑ کو اپنی بیٹی صفورا کا رشتہ تمھیں دیا اور اپنا داماد بنایا۔چونکہ حضرت شعیبؑ نابینا تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے اُن کی بھیڑیں چرائی،اچانک ایسی کون سی پیاس تھی کہ جس نے تم کو مجبور کیا کہ تم کوہ طور پر چڑھنے کی سوجھی حالانکہ وہاں پر موجود روشنی کی حقیقت تمھیں صحرا میں بسنے والے لوگوں کو معلوم تھی کہ وہ نور اللہ کا نور ہے۔آپ پھر بھی مطمئن نہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے کے لئے کوہ نوردی اختیار کی اور جیسے ہی تم اللہ سے ہم کلام ہوئے تو اُس جھاڑی پر نور کی بارش ہوگئی۔اُس پہاڑ کی زمین مقدس تھی اس لئے تم اپنے پھٹے پرانے جوتے اُتار کر اُس جھاڑی کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔تمھارے سجدہ ریز ہوتے ہی اُس جھاڑی میں آگ لگ گئی اور میرا پورا جسم اُس آگ کی وجہ سے جھلس گیا اور میں پرواز کرنے کے قابل نہ رہا۔اے موسیٰ آج اتنے سالوں بعد جب ایک بار پھر حق کی تلاش کے لئے نکلا ہوں اور اب کی بار میرا سفر

خواجہ فرید الدین عطارؒ کے پرندوں کے ساتھ کوہ قاف کی طرف نہیں بلکہ اس بار میں جوگیوں کی سرزمین ٹلہ جوگیاں جارہاہوں۔ کوہ طور کو اس لیے چھوڑا کہ وہاں کی عشق آتش کب کی سرد پڑ چکی ہے۔ اور ادھر آج تم پھر میرا راستہ روکے کھڑے ہو، آخر تمھاری پیاس کب بجھے گی۔

"جھکا ہوا موسےٰ گویا ہوا، جس جھاڑی میں سے یہ صدا آتی تھیں وہ گویا کوہ طور کی جھاڑی تھی وہ سجدہ ریز ہو جاتا اگر اُس کے گھٹنے اُس کا ساتھ دیتے کہ اُس جھاڑی اور اُس جھاڑی میں سے عشق ہی تو کلام کر رہا تھا۔ اے وہ جسے دانائے راز نے خاتون عجم کا لقب دیا، تو ہر اُس شخص کی آنکھوں کی ٹھنڈک جس کے سینے میں ڈاہڈی عشق آتش بھڑکتی ہے جو طاہرہ اور شفاف ہے، دُنیا بھر کے عشاق کے جذبات کی شدت کو اپنے شعروں میں بیان کرنے والی۔۔۔ بے شکوہ اویس قرنی ہو یا بلال حبشی، امام بوصیری ہوں، جنہوں نے قصیدہ بُردہ لکھ کر شفاء پائی اور اُنھیں خواب میں کمبل عطا کر دیا گیا جو قطوی کے سوار کے بدن کو ڈھانپتا تھا، ابو عبیدہ الحراج کے دانتوں کے درمیان ایک خلا ہو ۔۔۔ رومی، بلھّے شاہ، سچل سرمست، منصور یا حلاج ہوں اُن سب کی ترجمان تم ہو ۔۔۔ تم وہی ہو"۔[۱۶]

بوڑھا موسےٰ حسین مخاطب ہوا کہ جس جھاڑی میں سے ایسی آواز سنائی دیتی تھی کہ اُس جیسی آواز طور پہاڑ پر گونجتی تھی۔ جو حق اور سچائی کی آواز طور پہاڑ پر بلند ہوئی وہی آواز آج ٹلہ جوگیاں پہاڑ پر گونج رہی تھی اگر اُس کے گھٹنے اُس کا ساتھ دیتے تو وہ اُس جھاڑی کے سامنے بھی سجدہ کرتا لیکن وہ پڑھاپے کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا، طور پہاڑ پر بھی عشق ہم کلام تھا اور ٹلہ جوگیاں کے پہاڑ پر بھی عشق جلوہ افروز تھا، اس لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ کا عشق اور صوفیاء کا عشق دونوں مثالی تھے۔ جب عاشق کے اندر عشق کی آگ لگتی ہے تو پھر بلال حبشی جیسے لوگ تپتی ریت کی پرواہ نہیں کرتے، پھر حضرتِ اویس قرنی جیسے لوگ عشق کی انتہا کو پہنچتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ حضور ﷺ کے زمانے میں تھے لیکن براہ راست ملاقات نہ ہو سکی لیکن عشق اُن کا مثالی تھا۔ ابو عبیدہ الجراح جیسے عاشق پیدا ہوتے ہیں، یہ وہ صحابی تھے کہ جن کو رسول پاک ﷺ نے دُنیا میں ہی جنت کی بشارت دی تھی، ایسے ہی عاشق شرف الدین امام بوصیری تھے کہ جنہوں نے قصیدہ بردہ شریف لکھا تو رات کو خواب میں حضور ﷺ کا دیدار نصیب ہوا، کوڑھ کے مرض میں مبتلا تھے لیکن رسول پاک ﷺ نے اپنی چادر مبارک اُن پر ڈال دی۔ امام بوصیری صبح اُٹھے تو مکمل صحت مند

تھے۔ ایسے ہی اگر آج کے دور کے عشاق کی بات کریں تو اُن میں مولانا روم ہیں، بابا بلھے شاہ ہیں، سچل سرمست ہیں، اور منصور حلاج ہیں۔ یہ سب اپنے دور کے عظیم صوفی اور عارف تھے کہ جنہوں نے رب کی تلاش میں راہ تصوف کو چُنا۔ اِن سب لوگوں کا ترجمان عشق تھا اور اس عشق کی منزل آج بھی مکمل نہیں ہوئی، یہ آج بھی اُسی طرح برقرار ہے۔

> "طاہرہ پرندے نے آسمانوں سے اُتر کر زمین پر اپنے پنجے جمائے، اس توصیف سے ماورا صاحباں کے سامنے بیٹھے ہوئے طُوری جھلسے ہوئے پرندے کو متوجہ کیا اور مخاطب ہوئی "تیرے عشق میں ایک آنچ کی کمی رہ گئی۔۔۔ طُور کی جلتی ہوئی جھاڑی کے سامنے اُس مقدس زمین پر تو جوتیوں سمیت ہی چلا تھا اگر تُجھے ڈانٹ نہ پڑتی۔۔۔ تُو بے شک سجدہ ریز ہو گیا پر تیرے عشق میں انتہا نہ تھی، اگر ہوتی تو اپنے آپ کو اُس جھاڑی کی آگ کے سپرد کر دیتا، اپنے آپ کو اپنے محبوب میں مدغم کر کے اُس کی راکھ ہو جاتا۔۔۔ جیسے میں ہو گئی۔۔۔ تُو اپنے سینے پر اپنی ہتھیلی جماتا تو تیرا ہاتھ ید بیضا کے نور سے دمکنے لگتا پھر بھی تُو اُس سے دور رہا۔۔۔ دیکھ جب میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھتی تھی تو میرا ہاتھ بھی بہاؤ اللہ کی آتش سے روشن ہو جاتا۔ تُو نے اپنے آپ کو مکمل طور پر سُپرد ہی نہ کیا ۔۔۔۔۔ میں نے تو کر دیا۔۔۔ تُو جس طُور پر گیا وہ میرے ہی دل کی چوٹی تھی جس پر ایک جھاڑی یعنی میں جلتی تھی"۔[۱۷]

قراۃ العین طاہرہ جو راہ عرفان پر چلنے والی ایک عارفہ تھیں۔ فارسی زبان کی مشہور شاعرہ لاجواب حُسن کی ملکہ تھی۔ ٹلہ جوگیاں کی طرف آنے والے طاہرہ پرندے نے جب زمیں کی طرف پرواز کی اور اپنے قدم جمائے۔ وہ اپنی تعریف سے ذرا بھی متاثر نہیں تھا۔ وہ صاحباں پرندے کے سامنے بیٹھے ہوئے طور پہاڑ کے پرندے سے مخاطب ہوا اور اُس کو عشق کا جنوں اور راہ تصوف میں والہانہ عقیدت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ اے طور کے جھلسے ہوئے پرندے تیرا عشق ابھی مکمل ہی نہ تھا۔ تیرے عشق کی آنچ بہت ہی دھیمی تھی، اُس میں کافی حد تک کمی تھی جس وجہ سے تم نے اُس پہاڑ کی سرزمین کے تقدس کو پامال کیا اور جوتے پہن کر ہی تم اُس پہاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تمہاری کچھ سرزنش ہوئی اور تم نے جوتے اُتار دیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بنی اسرائیل کے نبی تھے اور تم نے اللہ کے حضور بہت سجدے کیے لیکن تمہارا عشق اگر کامل ہوتا تو تم اپنے آپ کو اُس جھاڑی میں لگنے والی آگ میں جھونک دیتے اور اپنے

محبوب کی محبت میں جل کر راکھ ہو جاتے۔ پھر تم وہاں سے سلامت نہ آتے اور ایک میں ہوں کہ اپنے محبوب کی محبت میں فنا ہو گئی۔ مجھ پر اتنا ظلم کیا گیا اُس کے باوجود میں بہااللہ کے راستے پر گامزن رہی، تُو اگر اپنے سینے پر ہاتھ رکھتا تو تمہارا ہاتھ ید بیضا کے نور سے جگمگ کرنے لگتا لیکن تُو نے ایسا نہ کیا۔ تم نے اپنے محبوب کو وہ محبت نہیں دی جس کا وہ حقدار تھا۔ تم میری طرف دیکھو میں جب بھی اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتی ہوں اپنے دل کو چُھوتی ہوں تو میرا ہاتھ بہاؤاللہ کے عشق کی آگ کی تپش کی وجہ سے دہکنے لگتا ہے۔ تُو جس طور پر حق کی تلاش میں بھٹکتا رہا ہے وہ میرے دل کی ایک پہاڑی تھی جس کی چوٹی پر ایک جھاڑی جو ہمیشہ روشن رہتی تھی وہ دراصل میں ہی تھی، میں ہی عشق کی آگ میں جل رہی تھی۔

> "اس سے پیشتر کہ تیری سکت دم توڑ دے، تو اپنی تھکاوٹوں اور ہڈیوں کے کڑکنے اور دم رُکنے سے پھیپڑوں کے ڈھے جانے اور دل کی جانب جو خون اگرچہ سست روی سے رواں ہے تُو اُس کے راستے میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے اور تیرا یہ دل تھم جاتا ہے تُو اے موسٰے تو وہ موسٰے تو نہیں جس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ تو بنی اسرائیل کو سر زمین مصر سے لے جا اور وہاں تمہارے لئے ایک اور سرزمین سرسبز اور زرخیز ہو گی اور یہ وعدہ پُورا ہو گا۔۔۔ تیرے ساتھ تو کوئی وعدہ نہیں کیا گیا، تو تنہا ہے تُو اگر یُوں کسی قبیلے کے بغیر یہاں ٹلہ جوگیاں کی ویرانیوں میں دم توڑتا ہے موت کا ذائقہ چکھتا ہے تو کیا تجھے قلق نہ ہو گا۔۔۔ بہت ہو چکی۔۔۔ جو اَن دیکھا تھا، وہ دیکھا جا چکا جو نامعلوم تھا معلوم ہو چکا، جو پوشیدہ تھا، تجھ پر ظاہر ہو چکا تُو لوٹ جا"۔[۱۸]

سفر کے اس موڑ پر موسٰے حسین کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ اے موسٰی اس سے پہلے کہ تمہاری ہمت جواب دے جائے تو تھکاوٹ کی وجہ سے اور اپنی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے یا سانس رُک جانے کی وجہ سے، یا تیرے پھیپھڑوں کے خراب ہونے سے اور دل کے دورے سے تیری موت واقع ہو جائے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم واپسی کی راہ لو، اُس کی وجہ یہ ہے کہ اے موسٰے تم وہ موسٰی نہیں ہو جس سے اُس کے رب نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہاری قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے مصر سے نکال کر فلسطین لے جائے اور اُس کے ساتھ یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ وہاں اللہ تعالیٰ اُس کو سرسبز اور زرخیز زمیں سے نوازیں گے۔ اُسے من و سلویٰ عطا کیا جائے گا لیکن تمہارے ساتھ تو ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا ہے۔ تُو بالکل اکیلا ہے اور یوں اگر تُو اپنے عزیز و اقارب کے بغیر اگر ٹلہ جوگیاں کے اس ویرانے میں دم توڑ گیا تو کیا تجھے افسوس نہیں

ہو گا۔لہذا اب اپنی اس کوہ نوردی کو ترک کر تم جس چیز سے ناواقف تھے وہ حقیقت تم پر آشکار ہو چکی ہے۔ہر حقیقت سے پردہ اُٹھ چکا ہے اب تو ہر سچائی پا چکا ہے،اس لیے بہتر ہے کہ تو اب لوٹ جا۔

(ب)عیسائیت کے حوالے سے

عیسائی مذہب قدیم ترین مذہب ہے جس کی ابتداء پہلی صدی عیسوی میں ہوئی اور یہ دُنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے ،اس مذہب میں کئی ایک فرقے ہیں جن میں سے سب سے بڑے فرقے " کا تھولک" اور "پروٹسٹنٹ " ہیں۔عیسائی مذہب میں خُدا کا تصّور ایسا ہے کہ تین خُداؤں کا عقیدہ زیادہ رائج ہے۔جن میں باپ ،بیٹا اور روح القدس ہیں ،یہ عقیدہ تثلیث کہلاتا ہے۔ایک اندازے کے مطابق پُوری دُنیا میں عیسائی مذہب کے پیرکاروں کی تعداد اِس وقت دوارب کے قریب ہے۔در حقیقت عیسائیت وہ مذہب جو اپنی اصل کو "ناصرہ" کے باشندہ یسوع کی طرف منسوب کرتا ہے اور اُسے خُدا کا منتخب قرار دیتا ہے۔عیسائیت کی تعریف ہم ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ وہ اخلاقی،کائناتی،تاریخی موخدانہ اور کفارے پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے۔جس میں اللہ تعالیٰ اور انسانیت کے تعلق کو خُداوند یسوع مسیح کی ذات ،شخصیت،اور کردار کے ذریعے سے پختہ کر دیا گیا ہے۔اخلاقی مذہب سے مراد یہ ہے کہ اس مذہب میں قربانیوں سے اور عبادت سے کوئی دُنیا کا خاص مقصد حاصل کرنے کے بجائے یہ بتایا گیا ہے کہ مذہب کا اوّلین مقصد اعلیٰ روحانیت کو حاصل کرنا ہے اور اللہ کی رضا کا طلب گار بننا ہے۔اسی طرح تاریخی سے مراد یہ ہے کہ اس مذہب میں بنیادی طور پر ایک تاریخی شخصّیت حضرت عیسی علیہ السلام کو ہی حاصل ہے۔کائناتی سے مراد یہ ہے کہ مذہب عیسائیت عالمگیر دعوت دین پیش کرتا ہے۔یہ مذہب کسی بھی تفریق،رنگ،یا کسی خاص نسل کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔کفارے کا مطلب یہ ہے کہ اس کفارے کے ذریعے انسان کو اللہ کے قریب کیا گیا ہے،کیونکہ گناہ سے وہ دوری اختیار کر چکا تھا۔اس ضمن میں پروفیسر میاں منظور احمد لکھتے ہیں۔

> اس تعریف میں تعریف کم اور تبلیغ زیادہ ہے۔مشرک قوموں نے اپنے شرک ہمیشہ فلسفیانہ موشگافیوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ہندوؤں جیسی بُت پرست قوم کے پڑھے لکھے لوگ بھی کہنے کو ایک خُدا کو مانتے تھے مگر کون احمق تسلیم کرے گا کہ وہ واقعی موحّد ہیں۔عیسائی علماء و فضلاء عقیدہ تثلیث کا جو بھی نام رکھیں اور اُس کی جو بھی تاویل یا تشریح کریں۔بہرحال یہ ایک صریح شرکیہ عقیدہ ہے۔اندر سے خُود

اُنہیں بھی اس تضاد کا احساس ہے مگر بات بنانے کی کوشش میں وہ اِدھر
اُدھر کی تاویلوں کا سہارا لیتے ہیں"[۱۹]

حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش بھی ایک یہودی خاندان میں ہوئی تھی ۔اس لئے وہ یہودی روایات کو خوب جانتے تھے۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے عام زندگی میں یہودی معاشرت اور قوانین کو اپنے اُوپر لاگو کیے رکھا۔ اپنی تعلیمات کو فروغ دینے کے لئے اُنہوں نے مذہب کی ایک نئی دُرست تعبیر کو پیش کیا اور اپنی سند کو یہودیت کی مقدس کتابوں کے ذریعے واضح کیا۔ اپنی نئی تعبیر میں حضرت عیسی علیہ السلام نے کئی مروجہ یہودی رسومات سے بھرپور اختلاف بھی کیا۔

مذہب عیسائیت کے بنیادی عناصر

عیسائی مذہب ایک عالمگیر مذہب ہے۔ یہ کسی خاص رنگ و نسل تک محدود نہیں ہے۔ یہ وہ تاریخی مذہب ہے کہ جس کی باقاعدہ تصدیق قرآن مجید میں بھی کی گئی۔ قرآنِ مجید میں عیسائیت مذہب کی تعلیمات کا باقاعدہ ذکر کیا گیا ہے لیکن اِس مذہب کی تعلیمات مذہب اسلام سے کافی مختلف ہیں۔

عقیدہ تثلیث

تین اقانیم عیسائی مذہب خاص اہمیت رکھتے ہیں جن میں باپ، بیٹا،اور روح القدس شامل ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک ذات سے مراد باپ ہے جبکہ بیٹا سے مراد خدا کی صفت کلام ہے اور روح القدس سے مراد خُدا کی صفت حیات و محبت ہے۔ یہ تینوں مل کر تین نہیں بلکہ ایک خُدا ہے۔

عقیدہ کفارہ

کفارہ کے لفظی معنی ڈھانکنے یا چھپانے کے ہیں یہ مسحیت کا اہم عقیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ یسوع مسیح نے صلیب پر اپنی جان کی قربانی دے کر بنی آدم کے تمام گناہوں کو چھپا دیا ہے۔ اُن کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے وہ سب کی نجات کا سبب بنے ہیں۔

ابتدائی عقائد

1۔ حضرت عیسیٰؑ کی حیات بعد الموت

2۔ الوہیت اور ابن اللہ کی حیثیت

3۔ اُن کا مسیح ہونا

4۔ خُدا کے دائیں جانب مسیح کا بیٹھنا

5۔ قیامت کے قریب دوبارہ آنا۔

کلیسا یا چرچ

کلیسا یا چرچ ایسی عمارت کو کہا جاتا ہے جہاں عیسائی عبادت کرتے ہیں۔ عیسائیت مذہب میں انگریزی لفظ چرچ کے مترادف میں لفظ کلیسا کا استعمال کیا جاتا ہے۔

رہبانیت

مذیب عیسائیت میں رہبانیت نے بہت عرصہ پہلے جنم لیا جس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ خُدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے دُنیا کے جھمیلوں کو خیر آباد کہا جائے۔ رہبانیت میں سادگی، پاکبازی، اور اطاعت شعار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ رہبانی عقائد کی روحانی شخصیتوں کو تسلیم کیا گیا کیونکہ اُنہوں نے رہبانیت اور عیسائیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

آپؑ کا نام عبرانی زبان میں یسوع، یشوع اور عربی زبان میں آپ کا نام عیسیٰؑ تھا۔ انگریزی میں Christ کہا جاتا تھا۔ مسیحؑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وصف اور "ناصری" آپ کا لقب اور کُنیت ابنِ مریم تھی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے باپ کا نام "عمران" تھا۔ مریمؑ کی والدہ "حنہ" اور یحیٰؑ کی والدہ "ایشاع" سگی بہنیں تھیں، جن کا تعلق ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔ "حنہ" کے زمانے جب بچّہ پیدا ہوتا تھا تُو اُس کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے ساری عمر وقف کر دیا جاتا تھا۔

حنہ نے اپنے پیٹ میں موجود بچے کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کر دیا کہ اگر اُس کو فرزندِ نرینہ عطا کرے گا تو وہ وقف کر دیں گی۔ لیکن جب مریمؑ کی پیدائش ہوئی تو حنہ بہت زیادہ حیرت زدہ ہوئی۔ نذر کے مطابق اُس کو بیت المقدس لایا گیا اور قرعہ کے ذریعے مریمؑ کے خالو حضرت زکریا علیہ السلام کو اُن نگران مقرر کیا گیا تھا۔ مریمؑ بڑی پاکباز اور نیک سیرت تھی۔ جب وہ جوان ہوئیں تو فرشتوں نے اللہ کی طرف سے عیسیٰؑ کی پیدائش کی خوشخبری سُنائی۔ بہت زیادہ حیرت زدہ ہوئیں لیکن فرشتوں نے اللہ کا حکم سُنایا کہ ایسے ہی ہو گا۔ مریمؑ بہت زیادہ پریشان اور بیت المقدس سے بیت اللحم کی طرف چلی گئی تاکہ لوگوں کی باتوں سے بچا جا سکے۔ انجیل کتاب کے مطابق مریمؑ کا نکاح یوسف بخار نامی شخص سے ہوا تھا اور اُسی نے مریمؑ کو بدنامی کے

خوف سے بیت اللحم لایا تھا، لیکن اس چیز کا ذکر کتاب و سنت میں نہیں ہے۔ بہر حال حضرت مریمؑ نے حضرت عیسی علیہ السلام کو بیت اللحم میں جنم دیا۔ اُس کے بعد مریمؑ نے بچّے کو قوم کے سامنے پیش کیا تو لوگوں نے کئی طرح کے اعتراضات کیے۔ مریمؑ نے فرشتوں کی ہدایت کے مطابق بچّے کی طرف اشارہ کیا تو بچّہ گہوارے سے بول پڑا۔ جس پر بچّے نے اپنی نبوت اور صاحب کتاب ہونے کا بتایا۔

حضرت عیسی علیہ السلام کی زیادہ تر پرورش کا مقام رملہ بتایا ہے، کچھ نے دمشق اور کچھ نے یروشلم۔ کتابِ انجیل کے مطابق ۳۳ برس کی عمر میں نبوت ملی۔

حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات

عیسائی مذہب کی تعلیمات حضرت عیسیٰؑ سے نہیں ملتی ہیں۔ عیسیٰؑ نے کسی جگہ پر بھی اپنے آپ کو خُدا کا درجہ نہیں دیا۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو آدمؑ کی اولاد کہا ہے۔ عیسائی مذہب کے پیرکاروں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ کائنات کے تمام انسان گناہ گار ہیں جو کہ بائیبل کتاب کی رو سے غلط ہے۔ بائیبل کتاب میں نیک آدمیوں کا بار بار ذکر آیا ہے۔ دوسرا عقیدہ یہ کہ مسیحؑ دُنیا کے تمام گناہ گار لوگوں کا بُوجھ اپنے کندھوں پر لے کر صلیب پر چڑھ گئے ہیں تا کہ صلیب پر ایمان رکھنے والے لوگ نجات حاصل کر سکیں۔ تیسرا عقیدہ یہ ہے کہ آدمؑ جس گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو اُس کا اثر ہر نسل میں چلتا آرہا ہے اور مسیحؑ کو اس لیے بغیر والد کے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ گناہ کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ بائیبل کی تعلیمات کے مطابق ممنوعہ درخت کا پھل حضرت حواؑ نے پہلے خود کھایا تھا بعد میں حضرت آدمؑ نے کھایا تھا۔ چوتھا عقیدہ اُن کا یہ ہے کہ چونکہ انسان نے گناہ کیا، خُدا کے رحم کا طلب گار ہوا اور اس مقصد کے لئے اللہ نے حضرت یسوعؑ کو دُنیا میں بھیجا تا کہ لوگ رحم سے مستفید ہو سکیں۔ اپنی جان صلیب پر دے دی انصاف کے تمام تقاضے پُورے کیے اور بنی آدم کو بخشش دلوائی۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں نیت کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اپنے "پہاڑی وعظ" میں جو کہ اُن کی تعلیمات میں ہے اہم حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے یہودی مذہب کے اکثر اخلاقی احکامات کو ظاہری حکم کے طور پر محدود نہ رکھا بلکہ اُن کے پیچھے جو نیت کارفرما تھی اُس کے مطابق حکم دیا۔

> "تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کرنا اور جو خون کرے گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصے ہو گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی سزا کے لائق ہو گا اور جو اُس کو احمق کہے گا وہ آتشِ جہنم

کا سزاوار ہو گا"۔[۲۰]

حضرت عیسی علیہ السلام کا طریقہ تبلیغ یہ تھا کہ وہ بہت سی نصیحتوں کو تمثیلی انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی بات کو ماحول اور وقت کو دیکھتے ہوئے اپنی تعلیمات کو کھلم کُھلا بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔۔ اس لئے وہ تمثیلی پیرائے میں بات کرتے تھے۔ جو سمجھنے والے ہوتے تھے وہ سمجھ جاتے تھے لیکن مخالفین پھر بھی محروم رہتے تھے۔ اُن کے اس انداز سے اَن پڑھ لوگ بھی بات کو آسانی سے سے سمجھ لیتے تھے۔

مقدس کتابیں

عیسائی مذہب میں الہامی کتابیں اِن کو جدید عہد نامہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بائیبل کا دوسرا حصّہ ہے اور اس حصّے میں ۲۷ کتابیں مجموعی طور پر شامل ہیں۔ چار انجیل ہیں، انجیلِ مرقس، انجیلِ متی، لوقا کی انجیل، یُوحنا کی انجیل وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف لوگوں کے نام پولوس کے خطوط، حواری پطرس کے دو خطوط، یعقوب کا خط، یہواہ کا خط، یُوحنا کے تین خطوط، یُوحنا کا معاشقہ۔ ان تمام مجموعوں کو پانچویں صدی کے آخر میں پُوپ کی طرف سے بالکل مستند قرار دیا گیا ہے۔

اناجیل اربعہ

اس میں عیسیٰؑ کا نسب نامہ، بچپن، لڑکپن، آپؑ کی جوانی کا دور، بعثت، پیغمبر ہونے کے کارنامے، سولی، موت، دفن ہونے کے بعد پھر قبر سے غائب ہونے تک کے واقعات شامل ہیں۔

انجیل مرقس

یہ سب سے پرانی انجیل ہے اس کا مصنف مرقس تھا۔ یہ یونان کا رہائشی تھا۔ انجیل کی یہ کتاب یونانی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ یہودی رسومات کی تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے اور یُوں لگتا ہے کہ یہ غیر یہودیوں کے لئے لکھی گئی ہے۔

انجیلِ متی

عہد نامہ جدید میں اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ محققین کی یہ رائے ہے کہ انجیل کا وہ حصّہ جو متی نے لکھا وہ اُس زمانے میں ہی ضائع ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ باقی ہے اُس میں مولف نے اپنے نام کو ظاہر نہیں

کیا ہے۔

"یہ پہلی انجیل ہے، عیسائی حضرات میں اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا یہ قدیم تر ہے یا مرقس کی انجیل، جن لوگوں نے اس کو متی حواری کی طرف سے منسوب کیا ہے وہ اسے قدیم تر ٹھہراتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ یہ عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی مگر اس چیز کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ واقعی متی حواری کی تصنیف ہے۔ اس کے نویں باب میں متی حواری کا ذکر ایک غیر آدمی کی مانند آیا ہے"۔[۲۱]

اِس کتاب کی سن تاریخ کے تعین میں بھی مورخین کے اندر بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۲۸ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کا زمانہ تالیف ۸۰ تا ۱۰۰ عیسوی ہے۔

لوقا کی انجیل

لوقا کا تعلق یہودی مذہب سے نہ تھا بلکہ اصل میں یونانی تھا، شروع ہی سے طباعت اُن کا پیشہ تھا۔ لوقا نہ صرف اس کتاب کی تالیف کی تھی بلکہ ایک اور کتاب "رسولوں کے اعمال" جو عہد نامہ جدید کا ایک بہت ہی اہم حصّہ ہے۔ وہ بھی اس ہی نے تحریر کی تھی۔

یُوحنا کی انجیل

یہ چوتھی انجیل ہے اس کتاب کا مولفؔ حضرت عیسی علیہ السلام کا شاگرد یُوحنا تھا مگر نئی تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ مصنف یُوحنا ایک اور شخص تھا جو کہ ایشائے کوچک کا رہنے والا تھا۔ اس انجیل میں عیسیٰؑ کی تعلیمات جامع، مختصر اور ناصحانہ انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ یوحنا کی انجیل میں نہایت ہی مدلل اور شعلہ بیان تقاریر بیان کی گئی ہیں جن کا موضوع حضرت عیسیٰؑ کی ذات ہے۔

عیسائی مذہب میں تصوف

عیسائی مذہب میں تصوف " ترک دُنیا" اور "نفی ذات "کے حقیقی تصوف سے تعلق رکھتا ہے۔ عیسائی مذہب میں خانقاہی نظام بہت منظم رہا ہے اور یہ مذہب کا ایک خاص جزو ایمان رہا ہے۔ عیسائیت میں تصوف کو سارتر کی زبان میں " اعدامیت" کہا جاتا ہے۔ عیسائی مذہب کے اندر تصّوف محض ایک رویئے کا نام نہیں بلکہ روحانیت کا ایک نظریہ بن کر اُبھرا ہے اور یہ ایک باقاعدہ منظم سلسلے کے ساتھ جوڑا ہوا ہے۔ خانقاہی نظام مذہب بدرجہ اَتم موجود ہے اور روحانی پاکیزگی کے لئے مختلف ریاضتیں اور مشقیں کرائی

جاتی رہی ہے۔عیسائی مذہب میں تصوف کو سمجھنے کے لئے بڑی ہی دلچسپ بات کی ہے

" عیسائی تصوف اور اُس کے داخلی روحانی نظام کی بنیادیں حضرت عیسی علیہ السلام
اور حضرت مریم علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ میں ہی پڑ گئی تھی "(۲۲)

حضرت عیسی علیہ السلام نے بھی یہودیت مذہب کو بھی اپنے دائرے میں رکھتے ہوئے ایک متصوفانہ تعبیر کو ذہن میں رکھتے ہوئے مذہبی زندگی کی بنیاد ایک ظاہری قانون کے بجائے ایمان اور قلبی تعلق پر رکھی۔عیسائی تصوف میں مذہب کے صوفیاء سر میں پڑنے والی جوؤں کو حکمت کے موتی قرار دیتے تھے اور چھ چھ مہینے تک پانی اپنے جسم کے اوپر نہ ڈالتے تھے۔اس حوالے سے سینٹ اوریجن کا بیان کچھ یُوں ہے

"اگر تم حواس کے دروازے بند کر کے دل کی آنکھیں کھولو،اگر تم جسمانی لذائذ سے
منہ موڑ کر روحانی کیفیات کا پیچھا کرو تو تم خُدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھو گے۔۔۔
حواس کی آنکھیں بند اور دل کی آنکھیں کھولنے سے خُدا اور اُس کا اکلوتا بیٹا بے نقاب
ہو کر سامنے آسکے گا"۔(۲۳)

جس طرح مسلم صوفیاء کے بعض حلقوں میں مرشد کامل اور پیر کامل کو "وسیلے" کے طور پر لیا جاتا ہے اسی طرح عیسائی مذہب میں وسیلے کا اہم ذریعہ حضرت عیسی علیہ السلام ہیں۔اُن کو گناہوں کی بخشش کا " دائمی وسیلہ" مانا جاتا ہے۔عیسائی مذہب میں صوفیاء ایسے بھی تھے جو کہ پانی پر چلتے،بیمار لوگوں کو صرف چُھوتے تو وہ ٹھیک ہو جاتا تھا،شیر کے اوپر سواری کرتے اور لوگ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔عیسائی تصوف کے اہم مراحل میں دُنیا کو ترک کرنا ایک بہترین عمل تھا،اس کے علاوہ روحانیت کے علاوہ ہر چیز کو ترک کیا جاتا تھا۔وسیلے کے نجات کا کوئی تصّور نہیں اور صوفیاء غیر معمولی طاقت رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ سبھی عیسائی جنت میں داخل ہوگے کہ اُن کے گناہ کا کفارہ ہو چکا ہے۔

ناول منطق الطیر جدید میں صوفیانہ عناصر عیسائیت کے حوالے سے

ناول منطق الطیر جدید میں سامی مذاہب کے حوالے سے صوفیانہ عناصر کو اُجاگر کیا گیا ہے اُن مذاہب میں جہاں کوہ طور کا جُھلسا ہوا پرندہ ایک نئے سفر کی تمنا لیے ٹلہ جوگیاں آتا ہے تو وہاں عیسائی مذہب کا پرندہ بھی ان پرندوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے دوسرے پرندوں کے سنگ ٹلہ جوگیاں کے پہاڑ پر پہنچتا ہے۔یہ وہ پرندہ جو حضرت عیسیٰؑ کی ہتھیلی جو خون کی بوند ٹپکتی ہے اُس سے جنم لیتا ہے۔حق اور سچائی کی تلاش میں انسان روزِ ازل سے لگا ہوا ہے۔ہر ایک کی تلاش کا ایک اپنا طریقہ کار ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ دُنیا

کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے، حقیقت کا رنگ بھی بدلتا رہتا ہے اس لئے سچ بھی کبھی مکمل کھول کر سامنے نہیں آتا اس میں کچھ نہ کچھ ادھورا پن رہ ہی جاتا ہے۔ اسی لئے آج کے دور میں سچائی کی تلاش میں دُنیا کے مختلف خطوں سے سفر کر کے اپنے مرکز ٹلہ جوگیاں آتے ہیں۔ بلاشبہ تصّوف ہی وہ واحد طریقہِ تعلیم و تربیت ہے کے جس پر عبد چل کر اللہ کی رضا کو حاصل کر لیتا ہے۔ صوفیاء کا طریقہ بھی یہی تھا اور یہ ابتداء ہی سے چلا آرہا ہے۔ ہر مذہب میں تصوف مختلف رنگ لیے صدیوں سے چلتا آرہا ہے۔ عیسائی مذہب میں بھی یہ کافی حد تک موجود ہے۔ عیسائی مذہب کا پرندہ راہ سیر و سلوک کی منازل کیسے طے کر کے ٹلہ جوگیاں کی طرف آتا ہے اور اس پرندے نے کیسے عشق کی منزل حاصل کی؟ اور اس پرندے کا وجود میں آنا کیسے ہوا؟ اس حوالے سے منطق الطیر جدید میں مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں

> "وہ ایک پرندہ ایک ناخن جتنا مختصر وجود میں آیا تھا جب ابنِ مریم کی بائیں ہتھیلی میں ایک میخ ٹھونکی گئی تھی اور اُس ہتھیلی کی لکیروں میں اُن مر چکے لوگوں کی فریاد تھیں جنہیں وہ اپنی مختصر حیات میں زندہ نہ کر سکا تھا اور اُس ہتھیلی میں جب ایک میخ ٹھونکی گئی اور اُس میں سے لہو کی ایک بوند پھوٹی، اُس ایک بوند نے شکایت کی، فریاد کی کہ اے میرے رب تُو نے مجھے کیوں اکیلا چھوڑ دیا ہے، میری مدد کو کیوں نہ آیا۔۔۔ اور جب اُدھر سے کچھ جواب نہ آیا، فریاد کی شنوائی نہ ہوئی تو اُس پہلی بوند میں سے ناخن جتنے پرندے نے جنم لیا ۔۔ جیسے پھانسی کے تختے پر گھاس نہیں اُگتی، ایسے ایک صلیب کے شہتیروں میں گھونسلا نہیں بنایا جا سکتا چنانچہ وہ پرندہ ابن مریم کے پیاسے ہونٹوں کے قریب ہوا، اُن پر اپنی چونچ رکھ کر اپنے مختصر بدن میں جتنی بھی نمی تیرتی تھی، بوند بھر بھی نہ تھی کہ وہ خود ایک بوند کا پروردہ تھا، اُس کے سوکھے ہوئے لبوں کو تر کرنے کی کوشش کی ۔۔۔ اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ابنِ مریم کو تنہا چھوڑا ۔۔۔ دریائے اُردن کی جانب اُڑا جس کے پانیوں سے یحییٰ نے لوگوں کا بپتسمہ کیا، اُنہیں نہلایا دُھلایا، ظہور میں آنے والے مسیحا کے لئے پوتر کیا۔۔۔ اُس دریائے اُردن کے پانیوں میں اُس نے اپنی چونچ ڈبوئی ایک بوند پانی کی بھری اور واپس آکر ابنِ مریم کے ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کو تر کیا" (۲۴)

عیسائی مذہب کا وہ چھوٹا سا پرندہ اُس وقت وجود میں آیا جب حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کے لئے اُن کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں پہلی میخ ٹھونکی گئی تھی اُس ہتھیلی میں اُن تمام مردہ لوگوں کی

آہ و زاریاں موجود تھیں، جنہیں حضرت عیسی علیہ السلام مرنے کے بعد اُن کو دوبارہ سے زندگی عطا نہیں کر سکے تھے۔ حضرت عیسی علیہ السلام کو اللہ نے یہ طاقت دی ہوئی تھی کہ وہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر لیتے تھے۔ یہ اُن کا ایک معجزہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کو جب صلیب پر چڑھایا گیا تو اُن کی ہتھیلی پر جب میخ ٹھونکی گئی تو وہاں سے خون نکل آیا۔ اُس خون کے قطرے نے پھر اللہ سے یہ التجا کی کہ اے میرے رب تُو نے مجھے آزمائش کی اس گھڑی میں تنہا کیوں چھوڑا دیا تھا۔ اے اللہ تُوں تو محبوب حق تھا تُوں نے میری مدد کیوں نہیں کی اور جب وہاں سے کوئی جواب نہ آیا تو پھر خون کے اس قطرے میں سے ایک چھوٹے سے پرندے نے جنم لیا۔ جس طرح پھانسی کے تختے کی سخت لکڑی پر گھاس نہیں اُگائی جا سکتی ایسے ہی پھانسی کے شہتیر پر گھونسلہ بھی نہیں بن سکتا ہے۔ اس لئے وہ چھوٹا سا پرندہ حضرت عیسیٰؑ کے پیاسے ہونٹوں کے پاس گیا اور اُس کے اپنے بدن میں جتنا بھی پانی تھا اگرچہ وہ محض ایک قطرے جتنا تھا۔ اُس نے اپنے تمام بدن کی نمی کو اکٹھا کیا اور حضرت عیسیٰؑ کے خشک ہونٹوں کو تر کرنے کی کوشش کی، وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو تن تنہا چھوڑے لیکن اُس نے اُن کو تنہا چھوڑتے ہوئے چلا گیا اور دریائے اُردن کی طرف محو پرواز ہو گیا۔ یہ وہ دریائے اُردن تھا جس کے پانیوں سے حضرت یحیی علیہ السلام لوگوں کو پاک کیا اور ان کے جسم اور روح کی غلاظت کو دور کر کے اُنہیں نئے آنے والے مسیح کی پیروی کے لئے تیار کیا، اسی دریائے اُردن کے پانیوں میں اس پرندے نے اپنی چونچ کو ڈبویا اور پھر چونچ میں ذرا سا پانی بھر کر واپس حضرت عیسیٰؑ کے پاس آیا اور ان کے پپڑی جمے لبوں کو تر کیا۔

> "وہ مسلسل عیسیٰؑ کی صلیب اور دریائے اُردن کے درمیان اُڑان کرتا بوند بوند پانی لاتا رہا اور ایک بار جب وہ واپس آیا تو صلیب کے شہتیروں پر میخوں سے ٹھونکا گیا ابنِ مریم وہاں نہ تھا۔ البتہ جہاں جہاں ہتھیلیوں اور پاؤں میں میخیں ٹھونکی گئی تھی وہاں وہاں لکڑی کے مساموں میں سے خون رِستا تھا۔ وہ آسمانوں پر اُٹھایا جا چکا تھا۔ وہ یہاں نہیں وہ تو بلندیوں کی جانب چلا گیا۔ پرندے نے اُس اُجڑ چکی صلیب کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اُس صلیب کا سنگھار ابنِ مریم تھا اُس کے اُٹھائے جانے سے وہ ایک بیوہ ہو گئی۔ وہ جانے کتنی صدیاں اُس کی جدائی سے نڈھال وہاں قیام پذیر رہا اور پھر اُس کے دل میں بھی شک کے ایک بوٹے نے جنم لیا۔ اگر وہ جس کے دربار میں ابن مریم نے فریاد کی

وہ بھی اُس کی مدد کو نہ پہنچا تو کیا وہ ہے بھی کہ نہیں۔ اگر ہے تو کس صورت کہاں ہے
اُس کی تلاش میں نکلنا چاہیے اور وہ نکل گیا"۔[۲۵]

وہ چھوٹا پرندہ لگاتار حضرت عیسیٰ اور دریائے اُردن کے درمیان عشق کی پرواز اڑتا رہا۔ وہ ہمہ وقت اپنے محبوب کے لئے محوِ پرواز رہا۔ وہ بار بار پانی لاتا اور حضرت عیسیٰؑ کے خشک لبوں کو پانی سے تر کرتا رہا اور اپنے ایمان اور عشق کو پختگی عطا کرتا رہا لیکن ایک دفعہ تو اُس یہ قیامت ٹوٹی کہ وہ جب پانی لے کر واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ سولی پر عیسیٰؑ وہاں موجود نہیں تھے۔ اللہ نے اُن کو زندہ زمین سے اُٹھا لیا تھا۔ اُن کی دُعا قبول چکی تھی اور وہ آسمان کی پُر نور بلندیوں پر تھے۔ لیکن اس پرندے نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تھا کہ جب عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھایا گیا تو وہ سولی کے لکڑی کے تختوں پر جگہ جگہ خون کے نشان تھے۔ ابنِ مریم کے پرندے اُس پھانسی کے تختے پر اپنا گھونسلا بنایا۔ حضرت عیسیٰؑ کے جانے کے بعد اُس جگہ کی حالت بھی ایک بیوہ کی مانند ہو گئی اُس جگہ کا حُسن حضرت عیسیٰؑ تھے اور کتنی صدیاں بیت جانے کے بعد بھی ابنِ مریم کا یہ پرندہ پھانسی کے اس تختے پر قیام پذیر رہا۔ پھر اچانک شک کے سنپولے نے اُس کو ڈنگ مارا کہ اگر وہ برحق خدا جس کے حضور حضرت عیسیٰؑ نے فریاد کی تھی تو فریاد فوراً نہیں سُنی گئی تو کیا وہ خُدا اُس کی مدد کو بھی آئے گا کہ نہیں۔ مزید اُس نے سوچا کی اس خُدا کا کوئی وجود ہے بھی کہ نہیں؟ اور اگر ہے تو کیسا ہے؟ اُس ابن مریم کے پرندے نے سوچا کہ مجھے ضرور اُس خُدا کی تلاش کرنی چاہیے، چناچہ اب کی بار وہ خُدا کو تلاش کرنے کے لئے ٹلہ جوگیاں کے مقام کی طرف رُخ کرتا ہے۔ وہ حق اور سچّائی کی تلاش میں میلوں کا سفر کر کے ٹلہ جوگی پہاڑ کی طرف آتا ہے۔

"ایک مہدی ظاہر ہو گا۔۔۔۔ جو بدی کے سلطنتوں کو مسمار کر دے گا، کُل خلقت
صرف اُس کے عقیدے کی پیروی کرے گی اور سب دُکھ مٹ جائیں گے۔۔ نہ
صرف امام مہدی کا ظہور ہو گا بلکہ حضرت عیسیٰؑ آسمانوں سے اُتر کر مسیح موعود ہوں
گے اور کُل دُنیا کے لوگ اُس الوہی چرواہے کی بھیڑیں ہو جائیں گی"۔[۲۶]

صوفی کا دل عشق حقیقی سے ہر دم منور ہوتا ہے۔ دُنیا کی آسائشیں اور لذتیں اُسے راہ حق سے ہٹا نہیں سکتیں اُس کا مقصد حیات رب کی اطاعت اور فلاح انسانیت ہوتا ہے، ہر دور اور ہر زمانے میں صوفیائے کرام اور ولی اللہ لوگوں کو ہدایت دیتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ پیغمبروں سے شروع ہوا اور ولیوں، صوفیوں کی صورت میں قیامت تک جاری رہے گا۔ کچھ عقائد کے مطابق جب دُنیا بدی کی لپیٹ میں مکمل طور پر آجائے گی تو پھر فلاحِ انسانیت کے لئے ایک امام مہدی کا ظہور ہو گا۔ وہ تمام بدی کو ختم کر دیں گے اور نیکی کو دور شروع ہو جائے

گا۔ حضرت عیسیٰؑ بھی آسمان کی بلندیوں کو چھوڑ کر زمین کا رخ کریں گے اور تمام گمراہ لوگوں کو ہدایت کی روشنی سے منور کریں گے اور تمام لوگ اُن کی پیروی کریں گے، اپنی منزلِ مقصود کو پالیں گے۔

"اور اُس لمحے اُس پر ایک عجب انکشاف ہوا، وہ اس گڈریے کی ذات، صفات اور بھیس کے بھید جان گیا۔۔۔ وہ ذات کا ترکھان تھا کہ لکڑی کو رندہ کرتے ہوئے اُس پر سے جو باریک چھلکے اُترتے ہیں وہ اُس کے لبادے پر جگہ جگہ اٹکے ہوئے تھے بلکہ اُس کی داڑھی کے بالوں میں ابھی اُلجھے ہوئے تھے۔ اُس کے باریک چہرے پر اذیت اور دُکھ کی دراڑیں تھیں اور اُن دراڑوں میں بھی بُرادے کے کچھ ذرّے دفن تھے جیسے اُس نے خلقِ خُدا کے کُل گناہوں کو اپنے سر لے لیا ہو۔۔۔۔ ہاں یہ وہی تھا جو مصلوب کر دیا گیا اور اُس کے رب نے اُسے ترک کر دیا، غفلت اختیار کر لی تبھی تو اُس نے صلیب پر فریاد کی۔۔۔۔ کبھی پانیوں پر چلتا اور کبھی مُردوں کو زندہ کرتا مسیحا وہی ابنِ مریم تھا جو یروشلم کی پتھریلی گلیوں کے ڈھلوانوں پر اپنے کاندھے پر اپنی صلیب اُٹھائے اور تب اُس کی تسموں والی جوتیوں میں اُس کے کومل پاؤں خوں آلود ہوتے تھے۔۔۔ ایسی ہی چرمی تسموں والی گانٹھوں سے بھری وہ جوتیاں تھیں جو طائف میں خون آلود ہوئیں"۔[۲۷]

موسیٰ حسین اپنی روح کی تشنگی کو دور کرنے کے لئے ٹلہ جوگیاں کی مسافت اختیار کرتا ہے اگرچہ اُس کی گرتی ہوئی صحت اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی لیکن ایک بار پھر وہ اندر کی خلش کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ ٹلہ جوگیاں پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اُس کی ملاقات جب ایک گڈریئے سے ہوتی ہے تو اپنے طور پر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ یہ گڈریا پیشے کے لحاظ سے ایک ترکھان ہے جو کہ لکڑی کا کام کرتا ہے۔ لکڑی پر رندہ کرتے ہوئے اُس کے باریک چھلکے اُس کے بالوں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اُس کے چہرے پر دُکھوں کی ایک گہری چھاپ تھی، ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اُس نے پوری انسانیت کا بُوجھ اپنے اُوپر اس طرح لیا ہو کہ جیسے تصّوف کی دُنیا میں مرشد اپنے مریدین کے دُکھ درد کا مداوا ہوتے ہیں اور وہ اپنے مرید کو سہارا دیتے ہیں۔ اسی طرح ابنِ مریم تھا جس کو ناکردہ گناہوں کی پاداش میں سولی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ سولی پر اُس نے اپنے رب سے التجا کی کہ اُس کو اس مشکل گھڑی سے نکالے لیکن چونکہ یہ ایک آزمائش تھی اس لئے رب نے اُس کو تنہا چھوڑا۔ یہ وہی ابنِ مریم تھا جو پانیوں پر چلتا تھا اور اپنے رب کے حکم سے ہی مُردہ لوگوں کو دوبارہ زندہ کرتا تھا۔ جو خلق

خُدا کی آسانی کے لیے خود مشکلات برداشت کرتا تھا۔ یہ وہی عیسیٰ تھا جو اپنی سولی کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائے یروشلم کی پتھریلی گلیوں میں چلتا تھا۔ اُس کے نازک پاؤں چلتے چلتے خون آلود ہو جاتے تھے۔ یہی خون دوبارہ اُس وقت بہتا ہے جب نبیِ آخر الزماں حضرت محمد ﷺ طائف کی بستی کو لوگوں کو دعوت حق دیتے ہیں تو اس قدر بے حس لوگ تھے کہ اُنہوں نے آپؐ کو پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا۔ آپؐ کے مبارک جوتے خون آلود ہو گئے لیکن راہ حق پر آپ سختی سے کاربند تھے۔ یہ وہ پیغام تھا اُن لوگوں کے لئے جو معرفت کی راہ میں رب کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ جو حقیقت کو پالیتے ہیں اور تمام مشکلات کو برداشت کر کے ولی کامل بن جاتے ہیں۔

" میں اُن گلیوں میں اپنی بے گناہی کی بھاری صلیب گھسیٹتا تم سے کہیں بڑھ اذیت میں تھا۔۔۔ ارد گرد جو ہجوم تھا وہ مجھ پر تو نگاہ ہی نہ کرتا تھا۔ صرف تمہیں نفرت یا عقیدت سے تکتا تھا۔۔۔ کسی نے میرے پیاسے حلق میں پانی کی ایک بوند نہ ٹپکائی تھی، کوئی بھی میرا ہمدرد نہ تھا، غضب میں آئے ہوئے اُس ہجوم میں سے کوئی نہ کوئی ہمدرد یا تو تمہارے رخساروں کو چھو کر سرگوشی کرتا تھا کہ اے میرے گناہوں کے کفارے میں مصلوب کیے جانے والے کنواری مریم کے بیٹے، تم ابد تک ہمارے گڈریئے، ہمارے چوپان رہو گے اور ۔۔۔ میں ۔۔۔ نہ کوئی عقیدت سے میرے رُخسار چھوتا ہے اور نہ مجھ سے ہمدردی کرتا تھا کہ اُن کی نظروں میں، میں ایک چور تھا۔۔۔ بلکہ مجھے وہ سب کہاں دیکھتے تھے، صرف تمہیں دیکھتے تھے۔۔۔ یُوں میں آج تک گمنام رہا"۔[۲۸]

حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ سولی پر چڑھائے گئے دوسرے لوگوں میں سے ایک چور بھی تھا۔ جس کو یہودی اس لئے پکڑ لائے تھے کہ ہفتے والے دن مچھلیوں کا شکار کر رہا تھا۔ جس کی یہودی مذہب میں اجازت بالکل نہ تھی۔ وہ چور شکایت بھرے لہجے میں ابنِ مریم سے مخاطب ہوا کہ تم نے تو معبدوں میں براجمان مذہب کے بوسیدہ عقائد سے بغاوت کی، تمہارا تو کچھ نہ کچھ قصور تھا۔ میرا کیا قصور تھا۔ میں جب تمہارے ساتھ یروشلم کی گلیوں میں صلیب اُٹھائے چلتا تھا تو میں تم سے زیادہ دردناک اذیت میں تھا لیکن کسی کو میری تکلیف کی پرواہ نہ تھی۔ اُن میں سے ہر شخص تم کو ہی محبت یا نفرت سے دیکھتا تھا کیونکہ اُن کے نزدیک صرف تم ہی اہم تھے۔ اُس مچھلیاں پکڑنے والے کی فریاد سے اندازہ یہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو رب کی راہ میں جس قدر مصیبت اور تکلیف جھیلتا ہے وہ اُس قدر زیادہ اہم ہوتا ہے وہ پھر مخلوق کے لوگوں کی نظر میں بھی زیادہ اہم ہوتا ہے۔ خاص

وہ نہیں ہوتا جو مچھلیاں پکڑنے والا ہوتا بلکہ خاص وہ ہوتا ہے جو لوگوں کو سچّے رب کی طرف بُلاتا ہے۔ یہاں پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو اللہ کی راہ میں اپنے آپ کو فنا کر لیتا ہے وہی محبت کے قابل ہوتا ہے ہر کوئی اُس کو محبت بھری اور حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ پہچان بھی اُس ہی کی باقی رہتی ہے جو حق پر ہوتا ہے وگرنہ عام بندے کی پہچان اُس کی موت کے کچھ عرصے بعد ختم ہو جاتی ہے۔

(ج) اسلام کے حوالے سے

مذہب اسلام کا عربی زبان میں مادہ "س ل م" جس کے معنی ہیں "تسلیم" کرنا، اطاعت کرنا، حکم بجا لانا۔ اسلام کا ایک معنی " صلح و سلامتی" بھی ہے۔ یعنی کہ امن و آشتی کو دُنیا میں پھیلانا۔ کائنات کے بہت سے مذاہب ایسے ہیں کہ جن کے نام کسی خاص شخص کے ساتھ منسوب ہیں، یا پھر اُس قوم کے نام کے ساتھ منسلک ہیں۔ جیسے بدھ مت، عیسائیت، اور زرتشتی مذہب کا نام اُن کے مذہب کے بانیوں کے نام پر ہیں جبکہ یہودی مذہب کا نام اُن کے ایک خاص قبیلے کے نام سے رکھا گیا جو کہ "یہواہ" کے پرستار تھے۔ مذہب اسلام ایک توحیدی مذہب ہے۔ اسلام ایک ایسا الہامی مذہب ہے کہ اس کا نام ہمارے ذہن میں آتے ہی ایک خاص مذہب، مخصوص طرزِ معاشرت، اور ایک خاص تمدن والے معاشرے کی تہذیبی تصویر ہمارے سامنے گھومنے لگ جاتی ہے۔ اللہ کے نزدیک بھی "دینِ برحق" ہی دینِ اسلام ہے۔ چناچہ ارشادِ خُداوندی ہے۔

" اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللہِ الاِسلاَم

بے شک اللہ کے نزدیک دین فقط اسلام ہی ہے"۔[۲۹]

کائنات میں جس قدر نظام اور زندگی کا فلسفہ موجود ہے اُن میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں ہے کہ جس کو ہم دین کہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ "دین" فقط اُس نظام کو کہا جاتا ہے جو ہر لحاظ سے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جو اپنے آپ کو نئے دین کے طور پر متعارف نہیں کراتا بلکہ اپنے پیغام کا آغاز حضرت آدمؑ سے کرتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کو دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اسلام کا نظریاتی عقیدہ "توحید" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا ایک ماننا۔ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں " کلمہ طیبہ " پہلے نمبر پر ہے۔ اسلام مذہب میں خُدا ایک ہے اور وہ ازل سے لے کر ابد تک ایک حقیقت ہے۔ حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری نبیؐ ہیں جن پر دین کی تکمیل ہوئی ہے اور حضرت محمد ﷺ کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے بلکہ یہ وہی دین ہے کہ جس کا آغاز حضرت آدمؑ سے ہوا۔ مذہب اسلام کے ماننے والے اللہ کے ہر پیغمبر کا دل و جاں سے احترام کرتے ہیں اور تمام انبیاؑ پر نازل ہونے والی کُتب پر کامل ایمان رکھتے ہیں

اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آسمانی کتب توریت، زبور، اور انجیل میں اب کافی تحریف ہو چکی ہیں لہذا یہ اب قابلِ عمل نہیں ہیں۔ اِن میں وقت کے ساتھ ساتھ کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔

مذہب اسلام کے بنیادی عناصر

بنیادی طور پر اسلام کے پانچ ستون ہیں جو کہ عبادات کا نظام واضح کرتے ہیں۔ اِن کو ارکان اسلام بھی کہا جاتا ہے۔

شہادت

کلمہ شہادت کے ذریعے ایک مسلمان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے نبی اور بندے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ عہد ہی باقی تمام عبادات اور عقائد کا اعلان کرتا ہے۔ کسی غیر مسلمان کو بھی اسلام مُیں داخل کرنے کے لئے یہ ہی تقاضا کیا جاتا ہے۔

نماز

دینِ اسلام کا اہم ترین ستون نماز ہے اور یہ اسلام کی اہم ترین عبادت ہے جسے حضرت محمد ﷺ نے اپنی آنکھوں کا نور اور مومنوں کی معراج کہا ہے، دن میں مسلمان پانچ مرتبہ نماز ادا کرتے ہیں۔ ادئیگی نماز کے وقت چہرے کا رُخ خانہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے۔ نماز کے اعلان کے لئے پہلے اذان دی جاتی ہے جس کو نماز کا بلاوا بھی کہا جاتا ہے۔ مسجد میں نماز باجماعت اجتماعی شکل میں ادا کی جاتی ہے جس کے لئے امامت کے فرائض امام صاحب ادا کرتے ہیں۔ انفرادی طور پر نماز کہیں بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ نماز عربی زبان میں ادا کی جاتی ہے اور قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے۔

روزہ

روزہ اسلام کا اہم رُکن ہے۔ رمضان المبارک میں مسلمان سحر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے سے اجتناب کرتے ہیں اور اِس دوران کچھ دیگر اُمور کی بھی ممانعت ہوتی ہے۔ روزے کا مقصد اللہ کا قرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ روزہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے لیکن خاص صورت حال میں نرمی ہے جیسے بیماری اور سفر کی صورت میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔

زکوٰۃ

اسلام کا اہم ترین رُکن زکوٰۃ ہے جو کہ ایک قسم کی مالی عبادت ہے۔ یہ ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر فرد پر فرض ہے۔ مال اور نقدی کی صورت میں کم از کم ساڑھے باون تولے چاندی اگر ہو یا ساڑھے سات تولے سونا تو وہ صاحبِ نصاب ہوتا ہے۔

حج

مذہب اسلام کا پانچواں رُکن حج ہے۔ حج ذی الحج کی نو تاریخ کو ادا کیا جاتا ہے۔ یہ ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ حج کے لئے احرام باندھنا ضروری ہوتا ہے جو کہ دو سفید چادریں ہوتی ہیں۔ حج کے مناسک میں خانہ کعبہ کا طواف، حجر اسود کو بوسہ دینا، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا اور منٰی کے مقام پر شیطان کو کنکریاں مارنا شامل ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر کی۔

جہاد

بعض فقہا جہاد کو مذہب اسلام کا چھٹا رکن کہتے ہیں جس کے معنی اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنا ہے۔ دین کی راہ میں خلوص دل سے کسی بھی کوشش کو جہاد کہا جاتا ہے۔ برائی سے بچنا اور اپنے نفس سے لڑنا بھی جہاد ہے۔ لوگوں کو اچھی بات بتانا اور بُرے کام سے روکنا بھی جہاد ہے۔ علم کی خاطر نکلنا بھی جہاد ہے۔

نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ

حضرت محمد ﷺ کی ولادت مکہ میں قبیلہِ قریش کے ایک معزز ترین خاندان بنو ہاشم میں ہوئی۔ آپؐ کی ولادت ۱۲ ربیع الاوّل کو مکہ میں ہوئی۔ آپ کی پیدائش کے بارے میں مختلف روایات ہیں بعض لوگوں کے نزدیک آپ کی پیدائش ۹ ربیع الاوّل کو ہے جبکہ شعیہ مسلک کے مطابق آپؐ کی پیدائش ۱۷ ربیع الاول کو ہے۔ آپؐ کی کنیت "ابو القاسم" تھی۔ آپؐ کے دادا کا نام عبد المطلب اور والدِ محترم کا نام عبد اللہ تھا۔ آپؐ پیدائشی یتیم تھے۔ آپؐ کے والدِ محترم آپؐ کی پیدائش سے چار پانچ ماہ پہلے وفات پا گئے تھے۔ آپؐ کی والدہ کا نام آمنہ تھا۔ جس برس آپؐ کی پیدائش ہوئی اُس سے پہلے قریش بدترین معاشی بدحالی کا شکار تھے لیکن آپ کی پیدائش والے سال ویران سرزمین پھر سے سرسبز و شاداب ہو گئی ہر طرف ہریالی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا جس سے قریش کے لوگ دوبارہ خوشحال ہو گئے۔ آپؐ چار سال کی عمر تک حلیمہ سعدیہ ہی کے گھر میں رہے

بعد میں آپؐ کی والدہ نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ جب آپؐ کی عمر چھ برس کی تھی تو آپؐ کی والدہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ آپؐ اللہ کے آخری نبیؐ ہیں اس کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ آپؐ کی بعثت بہت اعلیٰ اور ممتاز تھی۔

"حضور ﷺ کی بعثت مبارکہ کئی اعتبارات سے حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دیگر تمام انبیاؑ ورُسل کی بعثت سے ممیز اور ممتاز ہے۔ اُن میں سے چار پہلو نمایاں ہیں۔ پہلا یہ کہ آپؐ صرف اپنے سے پہلے مبعوث ہونے والے ایک رسول اور اُن کی کتاب کے مصدق نہ تھے بلکہ آپؐ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک پُورے سلسلہ نبوت کی تصدیق فرمانے والے ہیں۔ دوسرا یہ کہ آپؐ کی بعثت صرف ایک ملک یا خطہِ زمین کے لئے، صرف بنی اسماعیل یا بنی اسرائیل کی ایک قوم کے لئے اور صرف زمینِ عرب یا دُنیائے عجم کے لئے نہ تھی بلکہ آپؐ پُوری کائناتِ انسانی کی طرف رسول بن کر مبعوث ہوئے حتیٰ کہ آپؐ کی بعثت عالمِ اِنس کے علاوہ عالمِ جن وملائک کے لئے بھی ہے۔ تیسرا یہ کی آپؐ کی بعثت سلسلہ نبوت ورسالت کی آخری بعثت تھی، آپؐ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور قیامت تک تمام اَدواروَاَماکن کے لئے آپؐ کی رسالت نے فیض رساں رہنا ہے۔ چوتھا یہ کہ آپؐ کی کتاب و صحائف سابقہ کی ناسخ اور آپ کی شریعت تمام شرائع سابقہ کی ناسخ ہے اور قیامت تک صرف اسی شریعت کو واجبِ العمل رہنا ہے"۔[۳۰]

ابتداء ہی سے آپؐ کی عادات ایک نیک انسان کی طرح تھیں۔ غریبوں کی مدد کرنا، خلق، خدا کی خدمت کرنا، دُکھی لوگوں کے کام آنا، یہی وجہ تھی کہ لوگ آپؐ کے نیک اور مخلص رویئے سے آپؐ کو صادق اور امین کے لقب سے پُکارتے تھے۔ آپؐ کو شروع ہی سے بُت پرستی، شراب نوشی اور ہر قسم کی معاشرتی برائیوں سے نفرت تھی۔ ناچ گانے کی محفلوں، میلوں ٹھیلوں میں جانا اور لہولہاب جیسے مشاغل کو آپ دل سے بُرا جانتے تھے۔ قوم کے بڑے بڑے لوگ مختلف معاملات میں آپؐ سے مشاورت کرتے تھے۔ آپؐ کی رائے کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ آپؐ کی خصائص میں سے ایک صفت جامعیت تھی۔ دوسرے مذاہب ایک کامل زندگی کا احاطہ نہیں کرتے۔ اِن تمام کے مقابلے میں آپؐ کی رسالت زندگی کا ایک مثبت اور منظم ضابطہ پیش کرتی ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی تمام اُمتِ مسلمہ کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

حضور پاک ﷺ کی تعلیمات

حضور پاک ﷺ کی تعلیمات کا دائرہ کار اس قدر وسیع ہے کی جتنا زندگی کا دائرکار وسیع ہے۔ آپؐ کی تعلیمات زندگی کے موڑ پر رہنمائی فرماتی ہیں اور آپؐ کی تعلیمات ہی کو دینِ اسلام کہا جاتا ہے۔ آپؐ نے سب سے پہلے لوگوں کو اللہ کی واحدانیت اور رسالتِ محمدی کی تعلیم دی۔ اُس کے بعد لوگوں کو دوسرے عقائد سے روشناس کرایا۔

عبادات

مسلمانوں پر ایک دن میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے، جس کی ہر بالغ پر پابندی ضروری ہے۔ فرائض کے علاوہ کچھ سنت اور نوافل بھی ہیں جن سے باقی فرائض کی تکمیل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل ہوتا ہے۔

اللہ کے حقوق

دُنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ سب خُدا کا ہے۔ اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت کو اپنی زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اللہ کے دیئے گئے احکام کی ہر لحاظ سے پاسداری کی جائے اور شرک کی جو بھی صورتیں انسان کی فکر و عمل میں ہوں اُن کو قلع قمع کیا جائے۔

حقوق العباد

مذہب اسلام میں ماں باپ، پڑوسیوں، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، کے حقوق واضح انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اولاد کے حقوق، غیر مسلموں کے حقوق کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔
جن پر عمل کرنے سے معاشرے میں سکون اور امن و سلامتی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

معاشی احکامات

حلال رزق کمانے کے ساتھ ساتھ تمام حرام اور ناجائز طریقے سے دولت کمانے والے ذرائع کا کھول کر بیان کیا ہے۔ تمام حرام پیشوں کی وضاحت بیان کی گئی ہے اور ہاتھ سے محنت کر کے کمانے والے کو پسند کیا گیا ہے۔

آخرت پر ایمان

آپؐ نے اپنی تعلیمات میں روز آخرت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ آپؐ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی انسان

کی زندگی ختم ہونے والی ہے۔ ہر انسان پر موت آنی ہے اور اُس نے اللہ کے حضور ایک نہ ایک دن پیش ہونا ہے۔ ایک دن اللہ اس تمام مخلوق کو ملیا مٹ کر دے گا۔ پھر تمام انسانوں کو ایک نئی زندگی عطا کی جائے گی۔ تمام اعمال نامہ اللہ کی عدالت میں پیش ہو گا اور اایک ایک اعمال کا حساب دینا ہو گا۔

کتابوں پر ایمان

اللہ نے جتنی بھی مذہبی کتابیں نازل کی ہیں اُن کو مذہب اسلام میں تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ رسول، کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے اب تک جتنی بھی کتابیں اپنے پیغمبروں پر نازل کی ہیں، اُنہیں دل سے مانا جائے۔ آخری کتاب قرآن مجید ہے اُس کی کثرت کے ساتھ تلاوت کی جائے اور اُس کے معنی کو سمجھا جائے۔ چونکہ سابقہ تمام شریعتیں اب منسوخ ہو چکی ہیں اس لئے سابقہ کتابوں پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ اب عمل صرف قرآن مجید کتاب پر ہو گا۔ باقی تمام کتابوں میں تحریف ہو چکی ہے۔ یہ وہ واحد کتاب ہے کہ جس کا حفاظت خود رب نے اپنے ذمہ لی ہے۔

مذہب اسلام میں تصوف

اسلامی تصوف کا اہم مرکز "قرآن و سنت" ہے۔ مذہب اسلام میں خالص تصوف وہ ہے ہر اُس رائے کو، تصّور کو، نظریئے کو رد کرتا ہے جو شریعت کے اُمور کو رد کرتا ہے۔ تصوف کا ماخذ ہی دل کی پاکیزگی اور اللہ کی توجہ ہے۔ صوفیائے کاملین نے اپنے اپنے ادوار میں اپنے مختلف انداز میں تصوف کے اسرار ورموز کو بیان فرمایا ہے اور اس ضمن میں لوگوں کی رہنمائی فرمائی ہے۔ اسلامی تصوف میں "توحید" کے موضوع کو بنیادی نوعیت حاصل ہے اور صوفی ہر لحاظ سے شریعت کا پابند ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کی آمیزش سے پاک خالص توحید پر ایمان رکھتا ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ ہی خالص توحید کے تصور کی ترجمانی ہے۔ اسلامی تصوف میں "صوفی" کی اپنی مرضی نہیں رہتی بلکہ اُس کی مرضی حق کی مرضی کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ جو اللہ کی رضا وہی صوفی کی رضا، یوں اُس کی مرضی اور اللہ کی مرضی ایک ہو جاتی ہے۔ تصوف اور عمل کے بارے میں حضرت سلطانِ باہوؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

> "اور جو آدمی علم کو قلب وروح کے تصفیہ وتزکیہ کے لئے استعمال کرتا ہے وہ باعمل و ہوشیار عالم لائقِ دیدار ہے۔ ایسا ہی عالم باللہ، عالم فی اللہ وعالم ولی اللہ مراتب علم سے آگے بڑھ کر فقیر اولیائے اللہ کا خطاب پاتا ہے اور تصّور اسم اللہ سے غرقِ توحید ہو کر حضرت بایزیدؒ کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے"۔ (۳۱)

اسلامی تصوف میں توحید کے ساتھ انسان دوستی کو بھی بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اُن کی تعلیمات میں توحید کے درس کے ساتھ بلا تفریق انسان دوستی کا درس بھی ملتا ہے۔ صوفیاء کا انسانیت کے ساتھ اُنس انتہا درجے کا ہوتا ہے۔ اُن کی نظر میں سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ اسلام میں تصوف کو ابتدائی دور سے ہی ایک اسلامی نظریہ کے طور پر ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کو علمِ باطنی قرار دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے میکش اکبر آبادی لکھتے ہیں۔

> " دوسرے مذاہب کی طرح اسلامی تصوف مذہب کے ظاہری اعمال اور رسموں کے ردِ عمل کے طور پر پیدا نہیں ہوا بلکہ ابتدا ہی سے اسلام دُنیا کے سامنے ظاہر باطن کے مجموعے کے طور پر پیش کیا گیا"۔(۳۲)

لیکن اس حوالے سے اختلاف یہ پایا جاتا ہے بعض لوگوں کے خیال کے مطابق جب اسلام نے عروج پکڑا اور دور دور تک مسلمانوں کی حکومت پھیل گئی تو مسلمانوں میں خود بخود دو گروہ بن گئے تھے ایک طبقہ وہ تھا جو کہ اقتدار میں تھا جبکہ دوسرا طبقہ وہ تھا جو صوفیاء کا تھا۔ اسلام کے آغاز میں فقر اور جہاد مشترک تھے لیکن دورِ ملوکیت میں فقر صوفیاء کے حصے میں آیا جو کہ بہت زیادہ عبادت گزار تھے۔ یہ لوگ الگ گوشہ نشین ہو جاتے اور اللہ کی عبادت میں ہمہ وقت مشغول رہتے تھے۔ تصوف کی راہ پر چلنے والے وہ صوفیاء اور نیک لوگ ہوتے ہیں جن کے دل دُنیا و مافہیا کی محبت سے بیزار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے حضور دیدار محبوب کے ہر دم طلب گار ہوتے ہیں۔

منطق الطیر جدید میں مذہب اسلام کے صوفیانہ عناصر کا تذکرہ

ناول منطق الطیر جدید دور جدید کا ایک ایسا شاہکار ہے کہ جس میں تصوف اور قدیم روایات کو ایک نئے انداز اور ایک نئے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں مستنصر حسین تارڑ نے پرندوں کے ذریعے تصوف کے موضوع کو اُجاگر کیا ہے۔ تصوف کو پرندوں کے کردار سے واضح کیا گیا ہے۔ مذہب اسلام میں تصوف سے مراد اللہ کی قربت حاصل کرنا، تذکیہِ نفس، روحانیت اور ترکِ دُنیاداری ہے۔ اسلام میں تصوف کی روایت کافی پرانی ہے اور یہ اتنی منازل طے کرنے کے بعد آج بھی قائم و دائم ہے۔ بعض اکابرین کے مطابق مذہب اسلام میں تصوف کی ابتداء حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے سے ہوئی۔ خواجہ حسن بصری جو کہ آپ کے زمانے کے تھے اُن کو صوفیاء کرام اپنا شیخ والشیوخ مانتے ہیں۔ خواجہ حسن بصری کے مطابق زُہد کی بنیاد " حُزن و الم " ہے۔ تصوف میں خوف والم کا مسلک آپ ہی کے ساتھ منسلک ہے۔ اس کے

بعد منصور حلاج، جلال الدین رومی اور خواجہ فرید الدین عطار راہِ تصوف پر چلنے والے مسافر تھے۔ناول منطق الطیر جدید جو کہ تصوف کی ترجمانی کرنے والا ناول ہے اس میں اسلام کے تصوف کو کچھ اس انداز میں بیان کیا گیاہے۔

"اور پھر ایک ایسی شب آئی کہ چاندی کے جزیرے حرا کے شگافوں میں سے اُترے اور اُس کے فرش پر بچھ گئے۔۔۔چاند بجھ گیا، غروب کب کا ہو گیا لیکن چاندی کے جزیروں کا وہ فرش بچھا رہا کہ اُسے ایک یتیم اور بے آسرا شخص کے قدموں سے روندے جانے کی چاہت تھی،نہ اُسے باپ کا سایہ نصیب ہوا اور نہ اُس نے ماں کی آغوش کی حدّت کو محسوس کیا اور وہ پرندہ نہیں جانتا تھا کہ اِس شخص کا سایہ کائناتوں پر محیط ہو گا اور اُس کی آغوش میں ایک زمانہ روپوش ہو گا۔۔۔اور ایک ایسی شب نزول کی اُتری جب اُس پرندے کا ایک صدا سُنائی دی، حرا کے اندر چاندنی کے جزیروں کے بچھے قالین پر اُس کے وہ جُوتے دھرے تھے جن کی گانٹھیں اُس نے اپنے ہاتھوں سے لگا کر اُنہیں جوڑا تھا۔۔۔پرندے کا ایک بُوند بھر دل اُس کے جوتوں کی ہر گانٹھ میں بندھ گیا، دھڑکنے لگا، گواہی دیتا گیا، کہ یہی صادق ہے اور یہی امین ہے اور صدا اقرا کی آئی۔۔۔ہر گانٹھ میں بندھا اُس کا دل اقرا اقرا چہکنے لگا"۔[۳۳]

ایک ایسے پرندے نے جنم لیا جس کا تعلق اُس غار سے تھا جہاں نور کی شمع روشن ہوئی اور پھر یہ روشنی وقت کے ساتھ ساتھ دُنیا میں پھیل گئی۔اُس روشنی سے کائنات کے کئی چراغ روشن ہوئے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری وساری رہے گا۔یہ وہ پرندہ تھا جو کہ کئی صدیوں سے غار حرا میں موجود تھا۔وہ اُس نور کے جلوئے کو دیکھنے کے لئے ابتداء ہی سے بے چین تھا۔اس پرندے نے رات کی تاریکی میں وہ روشنی دیکھی کہ جس کی مثال ناممکن تھی۔اس جگمگاتی روشنی میں اُس نور کے پیکر کو دیکھا،چاندی کے جزیروں میں اُس نورِ مجسم کو دیکھا جو دُنیا میں آیا تو وہ پیدائشی یتیم تھا لیکن خود یتیموں کا والی تھا،خود بے آسرا تھا لیکن تمام لوگوں کا آسرا تھا،اُس کو نہ باپ کا سایہ نصیب ہوا اور نہ ماں کی گود نصیب ہوئی، لیکن یہ حقیقت میں وہ شخص تھا کہ جس کا سایہ کائنات کی ہر ایک چیز پر تھا،وہ پرندہ نہیں جانتا تھا کہ اِس بے آسرا شخص سے کُل کائنات کو راحت نصیب ہو گی۔اور جب نزول کی رات آئی تو اُس پرندے کو ایک آواز آئی۔غار کے اندر وہ مبارک جوتے بھی پڑے تھے کہ جن کو رسول پاک ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے مرمت کیا تھا۔یہاں سے یہ چیز ظاہر ہوتی ہے کہ صوفیاء کرام

نے بھی راہِ تصوف میں ہمیشہ سادگی کو اپنایا۔ سادگی صوفیاء وصف رہی ہے اور کوئی بھی ایسا صوفی نہ ہو گا کہ جس نے سادگی کو اپنا شعار نہ بنایا ہو۔ یُوں سادگی کی ابتداء رسول پاک ﷺ سے شروع ہوئی اور آگے صوفیاء کرام میں چلتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ تنہائی میں رب کو یاد کرنا بھی صوفیاء کی زندگی کا اہم وصف رہا ہے۔ صوفیاء بھی دُنیا سے الگ ہو کر میں اپنے رب کو کثرت کے ساتھ یاد کرتے ہیں جیسے کہ رسولِ پاک ﷺ غار حرا میں اپنے رب کو یاد کرتے تھے۔ اسی طرح تصوف کو منصور حلاج نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا جس کے بارے میں ناول منطق الطیر جدید میں تارڑ صاحب لکھتے ہیں۔

> "وہ ہمیشہ سے حلاج کی صحبت میں نہ رہا تھا، وہ تو دُنیا کے ہر لباس سے عاری تھا، اُس کو کوئی پیراہن ہوتا تو وہ اُس میں بُنا ہوتا۔۔۔ مُوت کی زردی برحق ہے لیکن "انا الحق" کے پرند جن کے اندر کوکتے ہیں وہ اپنے بریدہ بدن میں سے پھوٹتے لہو کو اپنے چہرے پر مل کر اُسے لال گلال کر لیتے ہیں اور اُسی لہو سے وضو کر کے اپنی نمازِ عشق ادا کر کے سُرخرو ہو جاتے ہیں، حلاج کے لوتھڑے کو بھی نذر آتش کر کے اُس کی راکھ کو دریائے فرات میں بہا دیا گیا۔۔۔ اُس پرندے نے اُسی راکھ میں سے جنم لیا تھا"۔[۳۴]

منصور حلاج فارسی زبان کے مصنف اور صوفی شاعر تھے۔ وہ حسین بن منصور حلاج کے نام سے جانے جاتے ہیں لیکن اُن کا اصل نام ابو المغیث الحسین ابن منصور الحلاج تھا۔ تصوف میں آپ کا نام کافی شہرت کا حامل ہے۔ منصور حلاج نے " انا الحق " کا نعرہ بلند کیا تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ میں ہی خُدا ہوں۔ حلاج کا باطنی حال بہت پختہ اور حوصلہ بلند تھا۔ حلاج کے بارے میں علماء کرام کی دو رائے ہیں بعض کا خیال ہے کہ وہ مرتد ہو گئے تھے جبکہ بعض صوفیاء کے نزدیک وہ ایک صوفی تھے۔ اُن کو دُرست کہنے والوں میں جلال الدین رومی اور خواجہ فرید الدین عطارؒ ہیں، جنہوں نے اُن کو برحق قرار دیا۔ حلاج کا عقیدہ حلول اور وحدت الوجود کا تھا، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے اندر "حلول" کر گیا ہے۔ اسی جرم کی پاداش میں ۳۰۱ ہجری کو گرفتار ہوئے اور سزائے موت دے کر حلاج کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ لیکن انا الحق کا پرندہ جس کے اندر سما جاتا ہے تو اپنے کٹے ہوئے جسم سے نکلنے والے لہو کو بھی اپنے چہرے کا حصہ بنا لیتا ہے۔ وہ عشق حقیقی میں غرق ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے اور اس کو اپنے لئے فخر کی بات سمجھتا ہے۔ وہ راہِ تصوف میں بڑی بڑی قربانی دینے سے دریغ

نہیں کرتا۔ منصور حلاج بھی اپنی جان قربان کر دی۔ اُس کو سولی پر چڑھایا گیا اور اُس کی لاش کو بھی آگ لگا کر اُس کی راکھ کو دریائے فرات میں بہادیا گیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا کہ عشق حقیقی کی منزل کوئی آسان نہیں۔ اس کے لئے کئی ایک مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ منصور حلاج اور حضرت جُنید بغدادیؒ کے بارے میں کچھ یوں تذکرہ کی گیا ہے۔

"عشق کا عروج کیا ہے؟ حلاج نے بُغداد کے جُنید سے پُوچھا۔ مجھ سے کیا پُوچھتے ہو۔۔۔ تم بغاوت پر آمادہ ہو۔۔۔ اپنی ذاتی شریعت تخلیق کر کے اپنے عشق کے چراغ جلاتے ہو، تم نہیں جانتے؟ نہیں مجھے کچھ خبر نہیں۔ تم جانتے ہو۔۔۔ مجھ سے مکر کرتے ہو۔۔۔ یہ سوال تمہاری برگشتگی اور مجذوبیت کی بے راہ راہروی میں سے جنم لیتا ہے۔۔۔ تم جانتے ہو۔ تب حلاج نے کہا میں اتنا جانتا ہوں کہ عشق کا عروج اے جُنید بغدادی تُو کل بھی دیکھے گا، پرسوں بھی اور پھر اُس سے اگلے روز بھی مشاہدہ کرے گا۔۔۔ انتظار کر۔۔۔ تُو جان جائے گا کہ حلاج کے عشق کا عروج کیا ہوتا ہے"۔[۳۵]

حضرت جنید بغدادیؒ اور منصور حلاج دونوں ایک ہی زمانے کے صوفی تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ منصور حلاج تصوف کی تعلیم کے لئے حضرت جنید بغدادی کے پاس آئے لیکن جلد ہی الگ ہو گئے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ حلاج سوالات جو کرتے وہ بے باکی سے اور حساس قسم کے کرتے جس سے ایمان میں انتشار اور خلش پیدا ہوتی۔ جُنید بغدادی شریعت و طریقت کے شناسا تھے۔ آپ کا شمار تاریخ کے عظیم صوفیاء میں ہوتا ہے۔ آپ نے تصوف کو شریعت کے مطابق کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، شرک وبدعات کی حوصلہ شکنی کی اور لوگوں کو اصل متصوفانہ افکار سے روشناس کرایا۔ آپ سے ایک دن حلاج نے عشق کی حقیقت کے بارے میں پُوچھا چونکہ دونوں شخصیات کا تعلق تصوف سے تھا تو دونوں عشق حقیقی جو کہ صوفیاء میں موجود ہوتا ہے، صوفیاء اس سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ تو اس سوال پر جُنید بغدادی نے کہا مجھ سے کیوں پُوچھتے ہو تم اپنی ذاتی شریعت کو نافذ کرنا چاہتے ہو حالانکہ تم اس چیز سے بخوبی واقف ہو تمہارا تعلق بھی صوفی ازم سے ہے۔ اس پر حلاج نے کہا کہ میں عشق کی حقیقت کو اتنا جانتا ہوں کہ تُوں حلاج کے عشق کا عروج کل بھی دیکھے گا، پرسوں بھی اور اُس سے اگلے دن بھی دیکھے گا۔ بس تُو انتظار کر، تُوں حلاج کے عشق کا عروج اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ جنید بغدادی حلاج کو ماننے کے باوجود اُن علماء کا ساتھ دیا تھا کہ جنہوں نے حلاج کے قتل کا فتویٰ

دیا تھا۔ لیکن اس معاملے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ قتل کے فیصلے پر جنید بغدادی کے دستخط تھے لیکن بعض کی یہ رائے ہے کہ جنید بغدادی اُس وقت موجود نہیں تھے۔ لیکن وہ کل کا دن جب آیا تو لوگوں نے منصور حلاج کے عشق کا عروج پھر دیکھا۔ بہت بے دردی سے حلاج کو قتل کیا گیا اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے لیکن اُس کے منہ سے ایک ہی آواز نکلتی رہی احد احد، پتھروں کی یلغار کی گئی اور پھر اُس پہلے پتھر سے عشق کے پرندے نے جنم لیا۔

" تم پہچان تو گئے ہو کہ میں غار حرا کے شگافوں میں بسیرا کرنے والا وہ پرندہ ہوں جس کے کانوں میں "اقرا" کی صدا آئی تھی اور میں نے پڑھ لیا تھا۔۔۔ مجھے سچّ کی تلاش میں نکلنے کی کچھ حاجت نہ تھی کہ سچّ اُن شگافوں میں سے داخل ہونے والے چاندنی کے اُن جزیروں میں تھا جو وہاں بچھتے تھے جہاں جہاں گانٹھوں بھری جُوتیوں میں پوشیدہ اُس کے پاؤں اُن پتھروں پر ثبت ہوتے تھے لیکن۔۔۔ ہم سب پرندوں کو عطار نے ایک ڈور میں باندھ دیا ہے۔۔۔ یُوں بھی ہم سب۔۔۔ ایک باہم عقیدے کی مختلف صورتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔۔۔ کوہ طور، بیت اللحم، اور حرا کی غار ایک ہی بندھن کے تسلسل کے پرندے ہیں۔۔۔ اگرچہ ہم مختلف گیت گاتے ہیں پر اُس گیت کی دُھن ایک ہی ہے "(۳۶)

غار حرا کا پرندہ مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے سچّ کی تلاش میں نکلنے کی حاجت اس لیے بھی نہیں ہے کہ سچّ کا اصل مرکز ہی وہ غار تھی جس میں رسول پاک ﷺ اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے اور جس جگہ پر آپؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ ہم سب عطارؒ کے پرندے تھے اور عطار نے ہم سب کو ایک وحدت کی لڑی میں پرویا۔ خواجہ فرید الدین عطار جو کہ خود صوفی تھے جنہوں نے حقیقت کی تلاش میں اپنا گھر اور مال ودولت سب کچھ چھوڑا اور اللہ کی راہ میں نکل پڑے۔ خواجہ فرید الدین عطارؒ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ جنہوں نے تصوف کے موضوع پر ایک کتاب تحریر کی جس کا نام "منطق الطیر" ہے۔ منطق الطیر ایک مثنوی ہے۔ عطار کی شاعری میں معرفت، استغناء، حیرت، مقامِ فنا، اور مقاماتِ تصوف وسلوک کو بہت ہی دل چسپ اور خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں پر منطق الطیر جدید کے مصنف مستنصر حسین تارڑ نے الہامی مذاہب کو ایک ہی لڑی میں پرویا ہے کیونکہ کوہ طور کے پرندے کا، بیت اللحم کے پرندے کا، اور غارِ حرا کے پرندے کا تسلسل ایک ہی پرندے کے بندھن سے ہے۔

"یہ وہی مے لالہ فام ہے۔۔۔ جس کے ہر جُرعے میں قرۃ العین طاہرہ کے عشق کے پنچھی بسیرا کرتے ہیں۔۔۔ یہ شراب عشق کی مدہوش مستی کی۔۔۔ تب وجود میں آئی جب۔۔۔ جب کُوبہ کُو اور کوچہ بہ کوچہ بھٹکتی دیوانگی میں طاہرہ کو ایک اندھے کنویں میں دھکیل دیا گیا۔۔۔ ایک مدت کسی کو علم نہ ہوا کہ وہ کونسا کنواں تھا جس میں اُس پاک رُوح کو گرایا گیا تھا۔۔۔ اُس کا گلا ایک ریشمی رومال سے گھونٹ کر کس اندھیاری گہرائی میں پھینک دیا گیا تھا"۔[۳۷]

قرۃ العین طاہرہ فارسی کی ایک مشہور صوفی شاعرہ تھی جو کہ ۱۸۲۳ کو ایران کے شہر قزوین میں پیدا ہوئی۔ قرۃ العین طاہرہ کا اصل نام زرین تاج تھا جو کہ پیدائشی طور پر شیعہ مسلک سے وابستہ تھیں۔ ایران میں اُس کا شمار خوبصورت ترین عورتوں میں ہوتا تھا اور جو کوئی اُس کی صورت کو دیکھ لیتا تھا وہ اُس کا دیوانہ ہو جاتا تھا۔ وہ ایران کے ایک عظیم عالم کی بیٹی تھی جس کا نام آیت اللہ ملا برغانی تھا جن کی والدہ کا نام آمنہ خانم تھا۔ یہ ابتداء ہی سے باغیانہ سوچ رکھنے والی اور ہر بات پر لفظ "کیوں" سے جرح کرنے والی عورت تھی۔ یہ علی محمد باب کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھی اور اُس کے ساتھ اِس کی خفیہ خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ قرۃ العین طاہرہ کو علی محمد باب سے حد درجہ عقیدت ہو گئی اور یہ علی محمد باب پر ایمان لانے والی پہلی خاتون مبلغہ تھی۔ سید کاظم نے اُن کو "قرۃ العین" کا لقب دیا جبکہ بہاءاللہ نے اُنہیں "طاہرہ" کا لقب دیا تھا اور وہ تاریخ میں بھی اسی نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ علی محمد باب نے یہ بھی کہا تھا کہ قرۃ العین طاہرہ کے جسم میں سیّدہ فاطمتہ الزھرا کی روح حلول کر چکی ہے اُس کے بعد اِن کو ایران میں میں زیادہ مقبولیت ملی۔ یہ علی محمد باب کے خلیفہ بہاءاللہ کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے کوچہ بہ کوچہ، اور ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک بابی مذہب کی تبلیغ کے لئے سرگرم ہو گیئں۔ اس نے بہت سے لوگوں کا اپنا گرویدہ کر لیا۔ دوران واعظ جب وہ اپنا نقاب اُتراتی تو لوگ اُس کے عقیدے کو فوراً تسلیم کر لیتے۔ قرۃ العین کے خاندان والے اُس کو قتل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ بابی مذہب سے کنارہ کشی اختیار کرے لیکن تمام تر کوشش رائیگاں گئی اور قرۃ العین نے یہ فتوی دیا تھا کہ اُس کا سسر اور خاوند واجب القتل ہیں۔ یہ سُن کر بابی بہت زیادہ جوش میں آ گئے اور اُنہوں نے محمد تقی کو قتل کر دیا تھا۔ اُس وقت ایران کے بادشاہ ناصر الدین قاچار نے قرۃ العین طاہرہ کو اپنے دربار میں بُلایا اور طاہرہ کی گفتگو سننے کے بعد اُس کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ گلہ دبا کر قتل کیا گیا اور پھر ایک اندھے کنویں میں اُسی طرح دھکیل دیا گیا جیسے یوسفؑ کو اور پُورن کو دھکیل دیا گیا تھا اور یوُں قرۃ العین طاہرہ نے اپنے آپ کو

بہااللہ کے عشق میں فنا کر دیا۔

"ایسی شراب کی کشید نہ تو فرانس کے تہہ خانوں میں، نہ شیراز کے نیم تاریک حجروں میں اور نہ ہی پنجاب کے کسی گاؤں کے کیکر کی جڑوں میں سے کشید ہوتی ہے۔۔۔ یہ بلھے شاہ کی۔۔۔ پی شراب تے کھا کباب تے ہیٹھ بال ہڈاں دی اگ۔۔۔ شاہ حسین کی لال شراب شمس تبریز کے جذب اور حلّاج کے کٹے ہوئے بازوؤں میں سے ٹپکتے خون سے اور ایک متروک شدہ کنویں کے پاتال میں سے ہی کشید ہوتی ہے۔۔۔ جن کی تہہ میں کبھی یوسفؑ، کبھی طاہرہ اور کبھی پُورن بھگت کو گرایا جاتا ہے"۔(۳۸)

صوفی کا دل عشق حقیقی سے مست ہوتا ہے اور اس مستی کے خمار میں وہ اپنے آپ فنا کر دیتا ہے۔ اُس کو جو سُرور اللہ سے دل لگانے میں ملتا ہے وہ سُرور کائنات کی پھر کسی چیز میں نہیں ملتا۔ اُس کو جو سکون اور فیض اس در سے ملتا ہے تو پھر وہ اس سکون میں مست ہو جاتا ہے اور یہ وہ مستی ہے جو کہ فرانس کے شراب خانوں میں نہیں ملتی اور نہ ہی دُنیا کے کسی اور جگہ سے ملتی ہے۔ اِس مستی اور خمار کا مرکز صوفیاء کرام کا در ہے۔ یہ وہ عشق والی شراب ہے جس کو بلھّے شاہ نے کشید کیا جو کہ متصوفانہ صفات والی شراب ہے۔ اسی طرح شاہ حسین مادھولال حسین جو کہ خود ایک صوفی بزرگ اور شاعر تھے، شمس تبریز جو کہ عظیم صوفی بزرگ تھے، اور منصور حلاج یہ چاروں شخصیات ایسی ہیں کہ جن کا تصوف میں بہت اعلیٰ مقام ہے لیکن یہ اعلیٰ مقام اُن کو کافی مشکلات اور انتھک محنت سے حاصل ہوا۔ انہوں نے یہ مقام عشق سے کشید کی گئی شراب سے ملا اور یہ وہ عشق تھا جس کا انجام وہ تاریک کنواں ہوتا ہے جس میں یوسفؑ کو قرۃ العین طاہرہ کو اور پُورن بھگت کو بلا آخر دھکیل دیا گیا تھا۔

"اپنی چونچ بند رکھو، موسےٰ نے اُسے ڈانٹا اور پھر اُس کے زخموں پر بُلھے شاہ کی مرہم کا پُوچا پھیرا، شاہ حسین، بابا فرید اور سچل سرمست کے سرمدی پھاہے رکھے۔۔۔ رومی کے جذب کے جزیرے اُس کے نوچے گئے بال و پر میں جذب کیے، میاں محمد کی شام کے دُھندلکوں کے پانیوں سے اُس کے زخم دھوئے"۔(۳۸)

حق اور سچ کی تلاش میں جب پرندے اپنے مرکز ٹلہ جوگیاں کی طرف بڑھتے ہیں تو اُن میں سے ہندومت کا پرندہ آہ وزاریاں کرتا ہے اور اپنے شکوے شکایت میں یہ کہتا ہے کہ باقی مذاہب کے پرندے بُدھ مت کے پرندے کو کچھ نہیں کہتے اور اُس کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں لیکن میرے وجود سے انکاری ہے۔ مجھے کسی صورت برداشت نہیں کرتے اور مجھے چونچیں مار مار کر اِن لوگوں نے زخمی کر دیا ہے۔ ایسی صورت حال

میں موسٰے حسین اُس ہندو مت کے پرندے پر پہلے تو نالاں ہوتا ہے اور اُس کو ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتا ہے۔ اُس کے بعد اُس کے زخموں کا علاج کرتا ہے اور اُس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ صوفی ازم میں رنگ و نسل اور مذہب کو اہمیت نہ بلھے شاہ نے دی، نہ بابا فرید نے، نہ سچل سرمست نے، نہ جلال الدین رومی نے اور نہ ہی مادھو لال شاہ حسین نے دی بلکہ انہوں نے ہر ایک کے ساتھ بلا تفریق برتاؤ کیا۔ سّچا صوفی رب کی مخلوق سے محبت بھرا برتاؤ کرتا ہے۔ اُس کی نظر میں رنگ، نسل اور مذہب کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، وہ ہر ایک کے دُکھ کا مدوا ہوتے ہیں۔ اُن کا اصل مذہب ہی انسانیت ہوتا ہے۔

> " ایسے نانک ایسے جتنے بھی اُس کی ذات میں گُم قریہ قریہ گھومنے والے اُس کے صوفی بندے تھے وہ سب کے سب شاعر اور موسیقار تھے۔۔۔ بُلھے شاہ بھی اپنی کافیاں اپنے ساز کی سنگت میں کوچہ کوچہ گاتا پھرتا تھا، یہ سازا بھی تک اُس کے مدفن کے پہلو میں محفوظ ہے۔۔۔ شاہ لطیف بھٹائی کی ستار اُس کے مزار سے متصل ایک شوکیس میں دیکھ لو۔۔۔ سچّل سرمست بھی اپنا اِکتارہ لیے پھرتا تھا۔۔۔ شاہ حسین اور شہباز عثمان مروندی قلندر بھی اپنے کلام پڑھتے تھے تو اُن کے مرید سنگت کرتے تھے "۔[۳۹]

رباب موسیقی کا ایک آلہ ہے جس کے بارے میں عام طور پر یہ تصّور کیا جاتا ہے کہ اس کی ایجاد بابا نانک نے کی تھی۔ لیکن ایک بات تو واضح ہے کہ بابا نانک رباب نواز تھے، وہ پنجاب کے گاؤں میں وحدانیت کے گیت گاتے تھے۔ بابا نانک ایک درویش تھے اور اُن کے مذہب کے بارے میں کچھ واضح نہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک سّچے مسلمان تھے، کچھ کی رائے میں وہ ہندو اور کچھ کی رائے میں وہ سکھ تھے۔ لیکن اس بحث سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو ایک بات واضح ہے کہ اُنہوں نے زندگی ایک صوفی کی حیثیت سے گزاری اور اس سلسلے میں کافی علاقوں کا سفر بھی کیا، بہر کیف وہ رباب بجانے والے، رب کی وحدانیت کے گیت گانے والے ایک صوفی بزرگ تھے۔ اور اسی طرح دوسرے صوفیاء کرام جو اللہ کی ذات میں گُم تھے وہ بھی گلی گلی پھیر کر رباب کے ساتھ اپنا صوفیانہ کلام لوگوں کو سُناتے تھے۔ اُن صوفیاء میں بابا بُلھے شاہ، سندھ کی دھرتی کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبد الطیف بھٹائی جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں تک اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچایا، سندھی زبان کے ایک اور صوفی شاعر سچل سرمست جن کا کلام سات زبانوں میں ہے وہ بھی رباب بجا کر لوگوں کو اپنا صوفیانہ کلام لوگوں کو سُناتے تھے، اس کے علاوہ شاہ حسین جو کہ مادھو لال

شاہ حسین کے نام سے مشہور تھے اور صوفیانہ کلام لکھنے والے شاعر تھے، اپنا کلام رباب بجا کے سُناتے تھے۔ سیہون شریف کے لعل شہباز قلندر جن کا اصل نام سید عثمان مروندی تھا اعلیٰ درجے کے صوفی تھے قلندری کلام پڑھتے تھے۔ اِن تمام صوفی شعراء کی شاعری عشق حقیقی پر مبنی شاعری تھی اور ان کی آواز میں ایک سوز تھا جو کہ سُننے والوں کے دل پر اثر کرتا تھا۔

> " صاحباں کا مرزا نوشہ پیر کی دُعا کی برکت سے جب کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ٹھہرا رہا، نویں مہینے میں ظاہر نہ ہوا تو نوشہ پیر کے معجزے سے وہ بارہویں مہینے جا کر پیدا ہوا۔۔۔ تو کیا وہ اُس پیر کے آسمانی رابطوں سے انکاری ہو سکتی تھی، ہیر کے لئے وارث شاہ نے پانچ پیروں کے واسطے دیئے تھے اور سوہنی بھی کچے گھڑے کو رب کے واسطے دیتی تھی۔۔۔ سوہنی گھڑے نُوں آکھدی۔ اج مینوں پار لنگھا گھڑیا، چنانچہ اُنہوں نے آسمانی پرندوں سے میل کرنے کے لئے لوٹنا تھا اور اُن کی کانفرنس میں شریک ہونا تھا"۔[۴۰]

ناول کے اس حصّے میں اُن زمینی پرندوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو نہ تو کسی بُدھ کی پسلی سے جنم لیتے ہیں، نہ کسی طور کی جھاڑی سے جنم لیتے ہیں، نہ کسی صلیب سے، نہ کسی غار کے شگافوں سے، نہ کسی دریائے فرات سے، نہ قرۃ العین طاہرہ، پُورن بھگت اور یوسفؑ کی طرح کسی کنویں سے اور نہ کسی بندرابن کی سرزمین سے کہ جس میں ایک ہزار کے قریب ہندو مندر ہیں۔ اَن کا دل عشق میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، یہ دل کی وادی میں جنم لیتے ہیں۔ انہیں سچّ کی تلاش میں کسی کوہ قاف پر جانا نہیں پڑتا بلکہ یہ خود ایک سچّائی کا مظہر ہوتے ہیں یہ اپنے دل کے پہلو میں جھانکتے ہیں تو قبلہ و کعبہ اِن کو وہی نظر آجاتا ہے۔ ٹلہ جوگیاں کے مقام سے جب عرش کے پرندے رخصت ہوتے ہیں تو پھر زمین کے پرندے آجاتے ہیں اور وہ ایک دم موسٰے حسین پر یلغار کرتے ہیں۔ اِن زمینی پرندوں میں مرزا صاحباں کا پرندہ، سوہنی مہنیوال کا پرندہ، اور ہیر رانجھے کا پرندہ شامل تھا۔ موسٰے حسین اُن سے دریافت کرتا ہے کہ اگر تم کو حق اور سچّائی کی تلاش نہیں ہے تو پھر یہاں ٹلہ جوگیاں کے مقام پر کیا لینے آئے ہو؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم سب اس مقصد کے لئے ٹلہ جوگیاں کے مقام پر آئے ہیں کہ ہم بھی اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا سکیں۔ یہ جو آسمانی پرندے ہیں جن کی شکلیں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ آپس میں ملتی ہیں یہ عقیدوں، رب کی طرف سے بشارتوں، اور آسمانی صحیفوں پر انحصار کرتے ہیں جبکہ ہمارا مذہب صرف اور صرف عشق ہے جو کہ اس مٹی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کا آسمانوں سے کیا

حساب کتاب؟ ہمارے صحیفے تو وارث شاہ، حافظ برخوردار تحریر کرتے ہیں جو کہ پنجابی زبان میں قصّے لکھتے ہیں۔ اور ہم پر تو بشارتیں بھی میرزے، رانجھے، اور مہینوال کی شکل میں اُترتی ہیں۔ ہم صرف یہ بتانے آئے تھے، اُس کے بعد یہ تینوں پرندے ٹلہ جوگیاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عشق کا مرکز رب کی ذات ہے، اِن زمینی پرندوں کا تعلق بھی رب سے ہے۔ اِن پرندوں کا بھی اللہ سے واسطہ ہے۔ یہ جو تینوں پرندے ہیں اِن کی رگ رگ میں جو عشق کی چنگاریاں جلتی ہیں کیا یہ ایسے ہی جل رہی ہیں؟ نہیں اِن کو جلانے والی وہ ذات ہے جو ہر چیز پر قدرت رکھتی ہے اور وہ ذات اللہ کی ہے اِن زمینی پرندوں کو بھی مدد اللہ کی جانب سے ہی آتی ہے۔ کیا صاحباں کا جو مرزا تھا اُس کو نوشاہیہ سلسلے کے پیر حضرت نوشہ گنج بخش قادری کے معجزے سے جنم نہیں کیا گیا؟ کیا نوشہ پیر کا تعلق اللہ سے نہیں تھا؟ کیا اُن کے اللہ سے رابطے نہیں تھے؟ یقیناً تھا۔ اسی طرح ہیر کو حاصل کرنے کے لئے بھی رانجھے نے پانچ پیروں کے واسطے دیئے جو کہ اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے تھے۔ مہینوال کی سوہنی بھی اُس کچے گھڑے کو اللہ کے واسطے دیتی تھی کہ مجھے اُس پار لے جا۔ اس لئے اِن پرندوں کا آسمانی پرندوں کے ساتھ تعلق موجود تھا اور اِنہوں نے پرندوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے واپس آنا تھا۔

> "اور یُوں ہم سب بے روح اور مُردہ ہوگئے ۔۔۔یکدم نہ ہوئے۔۔۔دھیرے دھیرے ہوگئے اور ہم سب اُس مُردنی کو محسوس بھی نہ کرسکے۔۔۔یہ نہ جان سکے کہ عشق کے خمار کے بغیر جو بلال، اویس قرنی، حلّاج، طاہرہ، سینٹ آگسٹائن اور بھگت کبیر ایسوں کی جنوں خیزی سے کشید ہوتا ہے، اُس کی آمیزش کے بغیر عقیدے کی شراب محض سادہ پانی میں بدل جاتی ہے۔۔۔تو پلیز ہمارا یہ کام کردو، اُنہیں واپس بُلا لو"۔[۴۱]

آسمانی پرندوں نے موسٰے حسین سے یہ شکایت کی کہ تم نے زمینی پرندوں کو واپس کیوں جانے دیا۔ اُن تین پرندوں کو جانے سے کیوں نہ روکا ہم اُن کے بغیر اُدھورے ہیں، ہمارا وجود اُن کے بغیر نامکمل ہے۔ اے موسٰے تم نے اُن عاشق پرندوں کو کیوں جانے دیا؟ اس پر موسٰے نے اُن سے کہا تم تو اُن سے ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہارے آسمانی عقیدوں سے منہ نہ موڑ لیں اور اُن زمینی پرندوں پر ایمان نہ لے آئیں۔ اب اگر وہ تمہارے لئے میدان خالی کرگئے ہیں کہ تم چونکہ آسمانی پرندے ہو اور وہ تمہارا مقابلہ کیسے کرسکتے ہیں لہٰذا تم جو مرضی ہے کرو، ہمارا تم سے کچھ لینا دینا نہیں۔ تم ہو کہ اُن کی واپسی کے لئے بے تاب ہو۔ آسمانی پرندے

کہنے لگے کہ اُن زمینی پرندوں کے بغیر ہماری شریعت مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اُس کی اہم وجہ یہ کہ عشق کے بغیر عبادت محض ایک جسمانی ورزش بن کر رہ جاتی ہے۔ لہذا مذہب میں عشق کا ہونا ضروری ہے۔ صوفیاء کرام نے بھی عشق کی بدولت حقیقت تک رسائی حاصل کی اور رب کو پالیا۔ کیا موسےٰ حسین عشق کے بغیر یہ ممکن تھا؟ یقیناً یہ عشق ہی تھا جو کبھی جنگلوں میں، کبھی صحراؤں میں، کبھی پہاڑوں میں، کبھی دریاؤں میں سفر کرتا تھا اور اپنی دُھن کا پکا تھا۔ اسی طرح جیسے جیسے مذہب سے عشق کا وجود ختم ہوا تو وہ مذہب بھی مردہ ہو گیا۔ مذہب کی سلامتی عشق میں ہے۔ عشق نہیں تو سب کچھ بے کار ہے۔ عشق وہ تھا کہ جس کا خمار حضرت بلال حبشی پر چھایا تو اُنہوں نے بڑی سی بڑی تکلیف کو برداشت کیا اور اپنے محبوب کو پالیا۔ حضرت اویس قرنی کے عشق کا یہ عالم تھا کہ اُنہیں جب معلوم ہوا کہ جنگ اُحد میں رسول پاک ﷺ کے دانت مبارک شہید ہو گئے ہیں تو اُنہوں نے اپنے تمام دانت اس وجہ سے گرا دیئے کہ اُن کے محبوب کے دانت شہید ہوئے تھے۔ منصور حلاّج کی رگ رگ میں جب عشق نے ڈیرہ جمایا تو جب اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے تو جسم کے ہر اُس ٹکڑے سے "احد احد" کی صدا بلند ہوتی تھی۔ ایسے ہی جب قرۃ العین طاہرہ نے بہا اللہ کے عشق میں اپنے آپ کو فنا کیا اور اندھے کنویں میں جا پہنچی۔ سینٹ آگسٹائن جس نے مسیحی مذہب کو دوبارہ زندہ کیا تو یہ اُس کا اپنے مذہب کے ساتھ والہانہ عشق تھا۔ بھگت کبیر نے بھی اپنے ہندو مذہب کے ساتھ عشق کیا تو وہ عشق تاریخ کا حصّہ بنا۔ گویا عشق سے ایمان کو تازگی اور روح کو سلامتی نصیب ہوتی ہے، اس لئے تم ہمارا یہ کام کرو کہ وہ زمینی پرندے کسی طرح واپس بُلاؤ، تم ہی ہماری آخری اُمید اور آس ہو۔

> "یہ وصف روز ازل سے بقیہ خدائی سے الگ تخلیق کیے جانے والے انسانوں میں میں بھرا ہوتا ہے۔۔۔ اور اُن لمحوں میں جب وہ جبلِ طور پر قدم رکھتے ہیں، یروشلم کی گلیوں کے پتھروں پر اپنی صلیب گھسیٹتے ہیں، جبلِ نور پر چڑھتے ہیں تو اُن کے اندر بھی ایک تبدیلی ہیت جنم لیتی ہے وہ وہ نہیں رہتے جو کہ وہ تھے۔۔۔ طاہرہ کو جب ایک اندھے کنویں میں گلا گھونٹ کر گرایا جاتا ہے، حلاّج کی لاش کو جلا کر اُس کی راکھ فرات میں بہادی جاتی ہے، بایزید بسطامی جب حج کو ترک کر کے ایک خارش زدہ کُتّے کے بدن پر مرہم رکھتا ہے، مولانا رُوم کے علم و دانش کو شمس تبریز کی ایک نظر آگ لگا دیتی ہے، ہمیشہ سچ کہنے والا سچّل سرمست ہو جاتا ہے، بُلھے شاہ مرشد کو منانے کے لئے گھنگھروں باندھ لیتا ہے۔۔۔ تو ان سب تبدیلی ہیت جنم لیتی ہے وہ وہ نہیں رہتے

جو کہ وہ تھے۔۔۔ یہ سب نوازے گئے لوگ ہوتے ہیں"۔ (۴۲)

اللہ کی انعام و کرامات اُن لوگوں پر خاص ہوتی ہے جو کہ رب کو اپنا محبوب بناتے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کو جو اپنے محبوب سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوتے۔ اس کا ساتھ ساتھ اللہ کی آزمائش بھی ایسے لوگوں پر کافی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی کئی ایک تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اُن کا مزاج عام لوگوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلی اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں میں بھی تھی جن میں حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، اور حضرت محمد ﷺ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہی مزاج کی تبدیلی آگے صوفیاء کرام میں بھی تھی۔ صوفیاء کی کیفیات میں بھی واضح فرق محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کہ قرۃ العین طاہرہ جس کو بہااللہ کے عشق میں گلا گھونٹ کر تاریک کنویں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ منصور حلاج نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا تو پھر سولی پر چڑھایا گیا اور جس کی لاش تک جلادی گئی تھی اُس کی راکھ کو دریائے فرات میں بہادیا گیا۔ ایسے بایزید بسطامیؒ ہیں جو کہ خود صوفی ہیں اور جن کا تصوف میں ایک بلند مقام ہے۔ جن کو سلطان العارفین کہا جاتا ہے۔ وہ ایک خارش زدہ کُتے کا علاج کرتے اور اس سلسلے میں حج کا ارادہ اس لئے ترک کر دیتے ہیں کہ اُس کُتے کی جان کو بچانا مقصود ہوتا ہے۔ مولانا روم جو کہ منطق اور فلسفہ کے اُستاد تھے۔ اُن کی ملاقات شمس تبریز سے ہوتی جو کہ ایران کے عظیم صوفی بزرگ تھے۔ اُنہوں نے مولانا روم کے علم کا خزانہ ایک تالاب میں پھینک دیا تھا۔ جس پر مولانا روم سخت پریشان ہوئے تو شمس تبریز مسکرائے اور ایک ایک کتاب باہر نکال کر رکھتے گئے۔ اس واقعہ پر مولانا روم حیرت زدہ ہوئے تو شمس تبریز نے کہا کہ تم یہ نہیں جانتے۔ اُنہوں نے مولانا روم کا ہاتھ پکڑا اور اُن کو قونیہ شہر میں تنہائی کے عالم میں تعلیم دی۔ ایک اور سندھی صوفی بزرگ جنہوں نے کبھی زبان سے جھوٹ نہیں بولا اور وہ تصوف میں وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اوچ گیلانیاں میں پیدا ہونے والے بابا بلھے شاہ اپنے مرشد کی خاطر جدائی کے عالم میں گھومتے رہے اور اُن کو منانے کے لئے پاؤں میں گھنگھروں باندھ لیئے۔ آپ نے تیس سال تک اپنے مرشد شاہ عنایت قادری کی خدمت کی اور اُن سے تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ یہ سب کے سب لوگ وہ تھے جو کہ اللہ کی طرف سے نوازے گئے اور جنہوں نے اللہ کی ذات تک رسائی حاصل کرنے کے انتھک کوشش کی اور جب اللہ کی ذات تک رسائی حاصل ہوئی تو پھر یہ اللہ کے رنگ میں رنگے گئے اور اِن کی اپنی ذات کی نفی ہوگئی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اکرم رانا، پروفیسر، ڈاکٹر، بین الاقوامی مذاہب، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۴۔ ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر، ڈاکٹر، تصّوف اور تصوراتِ صوفیہ، ٹیمپل روڈ، لاہور، پاکستان، ص ۶۷

۵۔ عماد الحسن آزادِ فاروقی، دُنیا کے بڑے مذاہب ، ادارہ تاریخ و ثقافت اسلامیہ، لاہور، دسمبر ۲۰۱۸، ص ۲۷۵

۶۔ رضا احمد، ڈاکٹر، اُردو ناول میں تصوف کی روایتِ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۶۲

۷۔ ایضاً، ص ۶۳

۸۔ مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر جدید، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۹۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۱۹۔ میاں منظور احمد، پروفیسر، تقابلِ ادیان و مذاہب، علمی بُک ہاوس، اُردو بازار لاہور، ص ۸۷

۲۰۔ عماد الحسن فاروقی، دُنیا کے بڑے مذاہب، ص ۲۹۹

۲۱۔ میاں منظور احمد، پروفیسر، تقابل ادیانِ مذاہب، ص ۱۱۵

22. William Stoddart, "Sufism" the Mystical Dotrines and the method of

Ialam, publisher, Bloomington, Indiana, 2006,P -17

۲۳۔ رضا احمد، ڈاکٹر، اُردو ناول میں تصوف کی روایت، ص ٦٦

۲۴۔ مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر جدید، ص ۲۰

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۰

۲٦۔ ایضاً، ص ۳۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۸۴

۲۸۔ ایضاً، ص ۸۷

۲۹۔ محمد طاہر القادری، پروفیسر، ڈاکٹر، منہاج الافکار، ۱۳٦۵ ایم ماڈل ٹاون، لاہور، جنوری، ۱۹۹۰ء، ص ۴۰۵

۳۰۔ محمد طاہر القادری، پروفیسر، ڈاکٹر، اسلام اور اہل کتاب، منہاج القران پبلی کیشنز، لاہور، جولائی ۲۰۱۴ء، ص ۳۴

۳۱۔ ماہنامہ، مراۃ العارفین انٹرنیشنل، العارفین پبلی کیشنز، لاہور، دسمبر ۲۰۱۵ء، ص ۴۲

۳۲۔ رضا احمد۔ ڈاکٹر، اُردو ناول میں تصوف کی روایت، ص ٦۹

۳۳۔ مستنصر حسین تارڑ، ناول، منطق الطیر جدید، ص ۲۲

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۹

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۲

۳٦۔ ایضاً، ص ۱۰٦

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۴۱۔ ایضاً، ص ۱٦۳

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۹۰

باب چہارم

مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات

.v مجموعی جائزہ

ادب کا دائرہ کار بہت وسیع ہے، یہ انسان کی مکمل زندگی پر چھایا ہوا ہے اور "ادب" وہ چیز ہے کہ جس کہ ذریعے ہر شعبہ ہائے زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ قوموں کی سلامتی ہی تب رہتی ہے کہ جب لوگ اپنی زبان کو، اپنی تہذیب کو اوراپنی ثقافت کو حد درجہ اہمیت دیتے ہیں۔ادب انسانی معاشرے پر گہرے نقوش چھوڑتا ہے اور قوموں کے وجود کو برقرار رکھتا ہے۔ادب ایک تہذیبی قدر ہے جس کے ذیعے ادیب اپنے تصورات و خیالات مختلف پیرائے میں لوگوں تک اس انداز سے پہنچاتا ہے کہ وہ اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔آغاز سے ہی انسان قصّے، کہانیاں، سُننے اور سُنانے کا شوق رکھتا ہے۔اس چیز سے انسان کو فطرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ادیبوں نے اس فطرتی لگاؤ کو اصنافِ نثر میں بیان کرکے لوگوں کی دلچسپیوں کو تقویت دی۔ڈرامے، افسانے، سفر نامے کی طرح ناول بھی ایک دل چسپ صنف نثر ہے۔اُردو ادب میں صنف ناول پر بہت کام ہوا ہے۔دور حاضر کے ناول نگاروں میں مستنصر حسین تارڑ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔وہ انفرادیت رکھنے والے ادیب ہیں اور صنف ناول میں اُن کی انفرادیت باقی لکھاریوں سے منفرد نظر آتی ہے۔اُن کے مشہور ناولوں میں پرندے، پیار کا پہلا شہر، بہاؤ اور راکھ شامل ہیں۔اس کے ساتھ اُن کا ایک نیا ناول جو کہ "منطق الطیر جدید" ہے، اس میں پرندوں کے ذریعے صوفیانہ عناصر کو اور تاریخی روایات کو بیان کیا گیا ہے۔مستنصر حسین تارڑ کا پہلا ناول "پرندے" تھا اُس میں بھی پرندوں کے کردار ملتے ہیں۔جو کہ پہلے پنجابی زبان میں تحریر کیا تھا لیکن بعد مستنصر حسین تارڑ نے اُس کو اُردو زبان میں تحریر کیا۔پرندوں سے مستنصر حسین تارڑ کو خاص لگاؤ ہے اور پرندے اُن کا دل چسپ موضوع ہے۔ناول" پرندے" ہو یا "منطق الطیر جدید" ہر ناول میں اُن کا ایک منفرد اسلوب واضح طور پر نظر آتا ہے۔ناول منطق الطیر جدید "تصوف" کے موضوع پر لکھا گیا ناول ہے۔تصوف سے مراد روح کی پاکیزگی اور حکمت اور دانائی ہے۔تصوف وہ کلمہ جو صفا سے مشتق ہے جس کا معنی صفائی ہے۔تصوف " الصوف" سے بھی مشتق ہے جس کا معنی " اُون " ہے۔چونکہ اُونی لباس اہلِ تصوف کے لئے ہے تو یہ صوفیاء لوگ اس لئے زیبِ تن کرتے تھے کہ یہ لباس زُہدو تقوی کے قریب تر ہے اور یہی لباس انبیا کرامؑ کا بھی ہوتا تھا۔اس وجہ سے اُونی لباس کو پسند کیا جاتا تھا۔بعض

علماء کرام اس کو اصحابِ صفہ سے منسوب کرتے ہیں جو کہ رسول پاک ﷺ کے دور میں تھے۔ لیکن تصوف کا عمل محض مذہب اسلام میں ہی نہیں ہے بلکہ یہ تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔ تصوف کا وجود سبھی ادیان کے اندر موجود ہے۔ تصوف کی راہ کو اختیار کرنے والے "صوفی" کہلاتے ہیں۔ صوفی وہ ہوتا ہے کہ جس کے دل میں رب کی محبت ہوتی اور وہ مخلوق خُدا سے شفقت و نرمی سے پیش آتا ہے۔ صوفی ہر انسان کے ساتھ بلا تفریق سلوک کرتا ہے اور اس سلسلے میں حسب و نسب اور مذاہب کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ دوسرا صوفی کا دل دُنیاوی حرص ولالچ سے پاک ہوتا ہے۔ صوفی ازم کے حوالے سے اُردو ادب میں کئی ایک ناول تحریر کیے گئے ہیں۔ اردو ادب کے پہلے ناول "مراۃ العروس میں بھی متصوفانہ رنگ کی جھلک واضح انداز میں دیکھائی دیتی ہے۔ اصغری کا کردار صوفیانہ طرز کا ہے جس میں وہ خواتین کو مختلف نصیحتیں کرتی ہے اور اُن کی روحانی تربیت کرتی ہے۔ ایسے ہی ڈپٹی نذیر احمد کا ناول توبتہ النصوح ہے جس میں صوفیاء جیسی وعظ و نصیحت ملتی ہے کیونکہ یہ ہی وعظ و نصیحت صوفیا کا بنیادی وصف رہی ہے۔ اس کے علاوہ ناول رویائے صادقہ ہے جس میں صادقہ کو سچّے خواب آتے ہیں اور وہ حقائق کو خوابوں کے ذریعے پرکھ لیتی ہے، بالکل ایسے جیسے کہ صوفیاء مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو اشارات کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے علاوہ جن ناولوں میں متصوفانہ صفات ملتی ہیں اُن میں رتن ناتھ سرشار کا ناول "فسانہ آزاد" ہے ، عمیرہ احمد کا ناول پیرِ کامل ہے۔ انتظار حسین کا ناول "بستی" ہے فصل کریم فصلی کا ناول "خونَ جگر ہونے تک" ہے جس میں متصوفانہ صفات کے ساتھ ساتھ "پیر جی" کے عنوان سے باقاعدہ کردار کو پیش کیا گیا۔ محمد یحییٰ خان کا ناول" موم کی مریم" ہے بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" متصوفانہ رنگ کو واضح کرتا ہے جس میں روحانیت کو سامنے رکھتے ہوئے حلال اور حرام کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ مستنصر حسین کا ناول " ڈاکیا اور جولاہا" ہے جس میں خانقائی نظام سے وابستہ سید زادی نجیب الطرفین کا کردار بیان کیا گیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا تعلق ادبی گھرانے سے نہ تھا بلکہ اُن کے والد بطور پیشہ ایک دُکان دار تھے۔ اس کے باوجود مستنصر حسین تارڑ کی اُردو ادب میں کافی خدمات ہیں اور وہ ایک ادیب کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے کئی ایک سفر نامے، افسانے اور ناول لکھے۔ اِس کے علاوہ وہ لمبے عرصے تک پاکستان ٹیلی ویژن کے ساتھ وابستہ رہے۔ اُن کی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان نے اُن کو ۱۹۹۲ میں صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "منطق الطیر جدید" بنیادی طور پر خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا تسلسل ہے۔ اُس کی وجہ یہ کہ مستنصر حسین تارڑ خواجہ فرید الدین عطار سے بہت زیادہ متاثر لگتے

ہیں اور اُن کو روحانی طور پر اپنا مرشد مانتے ہیں۔ خواجہ فرید الدین عطار کا تعلق ایران کے قصبے نیشاپور سے تھا۔ آپؒ کی بہت ساری کتابوں میں "تذکرۃ الاولیا" شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ تاہم خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر اور مستنصر حسین تارڑ کے ناول منطق الطیر جدید میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ جیسے کے نام کے ساتھ ظاہر ہے کہ بلحاظ عنوان دونوں فن پاروں کے نام ایک جیسے ہیں لیکن مستنصر حسین تارڑ کے ناول منطق الطیر کے ساتھ صرف جدید کا اضافہ کیا گیا ہے۔ دونوں کتابوں میں صوفیانہ عناصر کو خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دونوں فن پاروں میں پرندوں کے کردار ہیں لیکن بعض ایسی باتیں ہے کہ جن میں افتراقات پایا جاتا ہے جیسے بڑا اختلاف یہ ہے کہ فرید الدین کی کتاب منطق الطیر ایک مثنوی کی کتاب ہے جبکہ مستنصر حسین تارڑ کی کتاب منطق الطیر جدید ایک ناول ہے دونوں میں فرق اصناف کا ہے۔ منطق الطیر جدید ایک ایسا شاہکار ہے کے جس میں تصوف کو وسیع النظر کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ تصوف کا وجود ہر مذہب میں موجود ہے چاہے وہ غیر سامی مذہب ہو چاہے وہ سامی مذہب ہو، صوفی ازم ہر مذہب میں موجود ہے۔ غیر سامی مذاہب میں بُدھ مت مذہب ہے، جس کی زیادہ تر تعلیمات گوتم سدھارتھ کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں۔ گوتم کی ابتداء ہی سے طبعیت اس طرف مائل تھی کہ وہ تنہائی کو پسند کرتے لیکن اُن کی تربیت شاہی خاندان میں ہوئی۔ اُنیس سال کی عمر میں ایک ایسا واقعہ زندگی میں رونما ہوا کہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر فقیرانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ گوتم بُدھ نے درویشانہ زندگی کو پسند کیا اور دُنیا کی رنگنیوں سے منہ موڑ لیا۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے بہت سی ریاضتیں کیں، چلّے کاٹے اور جنگلوں میں زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ اس دوران گوتم بُدھ نے اس قدر فاقے کاٹے کہ اُن کا جسم سوکھ کر بالکل لاغر ہو گیا اور حالت ایسی ہو گئی کہ وہ موت کے قریب پہنچ گئے لیکن بُدھ مت مذہب کی بعض روایات سے اس بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ گوتم نے پہلی رات کو ہی وہ مقام اور علم پالیا تھا کہ جو روحانیت کے بلند پایہ تھا۔ گوتم بُدھ کی تعلیمات بُدھ مذہب کے ماننے والے لوگوں کے لئے مشعلِ راہ تھی۔ بُدھ مت تعلیمات بہت عرصے کے بعد تحریری شکل میں مرتب ہوئیں اُس کی اہم وجہ یہ تھی کہ گوتم سدھارتھ کے دور میں پڑھنے لکھنے کا رواج سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ بُدھ مذہب کے پیروکار ایک خاص فلسفے کے مطابق چل رہے ہیں۔ اِن کے مذہب کی حقیقت یہ ہے کہ بُدھ مت کے لوگ انسانی روح کے حوالے سے بالکل لاعلم ہیں اور یہ اس بات کا تسلیم ہی نہیں کرتے کہ انسانی روح کی بھی کوئی حقیقت اور سچّائی ہو سکتی ہے۔ بُدھ مت مذہب کے تصوف میں یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ انسان صرف زندگی کی سہولتوں سے ہی کنارہ کشی اختیار نہ کرے بلکہ انسان کو چاہیے کہ وہ دُنیاوی معاملات

کو ہر لحاظ سے مکمل طور پر ترک کرے، تب وہ متصوفانہ زندگی کا کاربند سمجھا جائے گا۔ بُدھ مذہب میں صوفی شخص کے لئے باقاعدہ طور پر "بھکشو" نام استعمال ہوتا ہے۔ ناول منطق الطیر جدید میں مذہب بُدھ مت کے صوفیانہ عناصر کو بیان کیا گیا تو اُس میں کپل وستو کے شہزادے گوتم بُدھ کی متصوفانہ زندگی کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ وہ فاقہ زدہ بدن جس کی کمزوری کی وجہ سے پسلیاں نظر آنے لگ پڑی تھی اُس کے کمزور جسم میں ایک پرندہ گھونسلا بنائے ہوئے تھا۔ وہ گوتم کی پسلیوں کے گھونسلے سے نکل کر ٹلہ جوگیاں کی سمت سفر کرنے لگ پڑا کیونکہ تمام پرندے جو اس دُنیا کے اندر وجود میں آئے وہ اُڑان بھر کے سچّائی کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ بُدھ مت پرندے کے اندر حق اور سچائی کی تلاش کی لگن موجود تھی۔ گوتم بُدھ کے انتقال کے بعد مذہب بُدھ مت کی تعلیمات کو آگے فروغ دینے کے لیے بھکشوؤں (صوفیاء) نے زیادہ کردار ادا کیا ہے۔ گوتم بُدھ نے رب کو تلاش کرنے کے لئے کافی تگ ودو کی، مختلف ریاضتیں کیں، چلّے کاٹے لیکن اُنہوں نے کسی جگہ پر بھی رب کے ہونے کا برملا اظہار کہیں نہیں کیا، اُنہوں نے اس حوالے سے کھول کر بات نہیں کی، اور نہ جہنم، دوزخ کے تصّور کے قائل تھے۔ بُدھ مت کے ساتھ ہندؤ مت مذہب میں بھی متصوفانہ صفات بد درجہ اتم موجود ہیں۔ یہ ایسا مذہب ہے جو مختلف عقائد و نظریات، تصورات پر مبنی ہے۔ اس مذہب کی ابتداء ہندوستان میں ہوئی اور اس مذہب کے پیروکار باقی ممالک میں بھی ہیں لیکن انڈیا اور نیپال میں اس مذہب کے ماننے والے لوگ زیادہ ہیں۔ تاریخ میں ان کے نظریات کا کوئی خاطر خواہ ذکر نہیں لیکن اس مذہب کے ماننے والے اپنی قدیم روایات کو ہی اپنی تاریخ مانتے ہیں۔ اِن کے لئے قدیم روایات ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "ہندو" آٹھویں صدی کی ایک کتاب میں ملتا ہے یہ لفظ کافی پرانا ہے اور قدیم فارسی کی کتابوں میں بھی یہ درج ہے۔ زرتشتیوں کی مقدس کتاب "اوستا" میں بھی "ہندو" نام تحریر ہے۔ ہندوستانی معاشرے کے لوگ مذہب کے لئے "دھرم" جبکہ آریائی لوگ "ویدک دھرم" جیسے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ہندو مذہب کا کوئی بھی ایک باقاعدہ بانی نہیں اس لئے ہندو دھرم کی مذہبی کتابوں کو بھی کسی ایک شخص کی طرف منسوب یا نام نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں " مہابھارت" زیادہ شہرت کی حامل کتاب ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کو ہندو مذہب کے ماننے والے لوگ ایک علم کا خزانہ تصّور کرتے ہیں۔ اُس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اُن کے بقول اس کتاب میں قدیم ہندوستان کے بارے میں حد درجہ معلومات جابجا ملتی ہیں۔ یہ کتاب قدیم ہندوستان کی مذہبی روایات، مذہبی و سیاسی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ مہابھارت کے بارے میں عام طور پر یہ رائے ہے کی اس کو " ویاس" نے تحریر کیا ہے۔ رامائن

کتاب بھی ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے لیکن یہ کتاب مہابھارت سے زیادہ مہذب اور اصولوں پر مبنی کتاب ہے۔اس میں رام چندر جی کے قصّے بیان کیے گئے ہیں اور رام چندر جی کو دلیر انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تیسری مذہبی کتاب "بھگوت گیتا" ہے۔یہ کتاب بھی ہندو مذہب میں زیادہ مقبول ہے اور ہندو لوگ سب سے زیادہ اس کتاب کو پڑھتے ہیں۔ہندو دھرم میں تصوف اس طرح موجود ہے کہ اس مذہب کے لوگ روحانی طاقت کو حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں اور اس حوالے سے ہندوؤں نے ریاضت کا ایک نیا طریقہ جس کو "یوگا" کہا جاتا ہے،اُس کو دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ہندوازم کا تصوف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان اپنا گھر،اپنی اولاد،اپنا مال سب کچھ چھوڑ کر ویرانوں میں اور جنگلوں میں رہائش رکھے اور دُنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو جائے۔ناول منطق الطیر جدید میں ہندو مذہب کے جوگی گورکھ ناتھ کا بھی ذکر ہے جو ہندو مت مذہب کے بانی ہیں اور انہوں نے ہی ٹلہ جوگیاں کی بنیاد آج سے دو ہزار سال قبل رکھی تھی۔انہوں نے اپنے مذہب کے اندر صوفیانہ کاوشیں کیں۔ہندو مت کے تصوف میں بھرتری ہری کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔بھرتری کا تعلق شاہی خاندان سے تھا،وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔اُس کی بیوی نے اُس کے ساتھ بے وفائی کی تو اُس نے شاہی زندگی چھوڑ کر "فقر" کی زندگی شروع کر دی اور اپنا مسکن جنگلوں کو بنایا۔بھرتری ہری سے علامہ اقبال کافی متاثر تھے۔تیسرے غیر سامی مذہب میں "سکھ مت" ہے۔ سکھ مذہب کے رہنما بابا گرونانک ہیں اور یہ سکھ مت کے پہلے گورو ہیں۔سکھ مذہب اللہ کی وحدانیت پر کامل یقین رکھنے والا مذہب ہے اور سکھوں کی روحانی شخصیت گرونانک نے اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کیا ہے،اس لئے اس کو توحیدی مذہب بھی کہا جاتا ہے۔گورونانک بُتوں کی پُوجا کی سخت مخالف تھے اور مذہب اسلام سے اُن کا لگاؤ کافی مثالی تھا۔اس سلسلے میں اُنہوں نے مکہ معظمہ میں بھی حاضری دی اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار پر بھی حاضری دی۔گرونانک کی زندگی میں کئی ایک متصوفانہ واقعات رونما ہوئے ہیں اور اُن کی باتوں سے بھی متصوفانہ فکر عیاں ہوتی تھی۔گو اس میں کوئی شک نہیں کہ بابانانک کی پیدائش ہندو گھرانے میں ہوئی لیکن اُن کی تعلیمات ایسی تھی جن سے ہندو معاشرے کی نفی ہوتی ہے۔نانک کو اس بات پر کامل یقین تھا کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کی مرضی سے ہی ہو رہا ہے۔سکھ مذہب میں تصوف کی ابتداء بابانانک سے ہوتی ہے۔بابانانک نے گھر کی سکون والی زندگی چھوڑ کر،درویشانہ زندگی کا آغاز کیا اور مختلف درباروں پر چلے کاٹے جن میں خواجہ معین الدین چشتی کا مزار بھی شامل ہے۔بابانانک کا شمار بھی اُن شخصیات میں ہوتا ہے،جنہوں نے روحانی مرکز ٹلہ جوگیاں پہاڑ کی جانب سفر کیا۔ٹلہ جوگیاں پہاڑ ایسا ہے کہ جہاں پر تقریباً ہر مذہب کے

صوفیاء نے قیام کیا لیکن بابا نانک نے تو صوفی ہونے کی حیثیت سے کئی مقامات کا سفر کیا جن میں سے حسن ابدال کا سفر بھی قابلِ ذکر ہے۔ غیر سامی مذاہب کی طرح سامی مذاہب میں بھی تصوف کی روایت ملتی ہے۔ الہامی میں اگر یہودی مذہب کو دیکھا جائے تو اس مذہب کا شمار توحیدی مذاہب میں ہوتا ہے۔ اس مذہب کے لوگوں کو "بنی اسرائیل کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بنی اسرائیل قوم نے بہت سارے معبود بنائے ہوئے تھے اور یہ مختلف دیوتاؤں کی پُوجا کرتے تھے۔ مذہبی دیوتاؤں کے علاوہ بنی اسرائیل پتھروں کی پرستش کرتے اور دیوتاؤں کی تو ایسے عبادت کرتے کہ ہر خاندان کا الگ قومی دیوتا ہوتا تھا۔ جب یہودی قوم توحید کی طرف آمادہ ہوئی تو ان سب دیوتاؤں کا وجود ختم ہو گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی اور اُنہوں نے اپنے رب کے حکم کے مطابق فرعون کے دربار میں پرورش پائی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نبی ہونے کی نشانی فرعون کو دیکھائی تو فرعون اس بات پر شدید غصّے میں ہوا۔ اس کے ردِ عمل میں اُس نے پیغمبر خُدا کو اور بنی اسرائیل قوم کے لوگوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے طور پہاڑ پر چالیس دن قیام کیا تو اللہ نے موسیٰؑ کو شریعت عطا فرمائی۔ کوہ طور پر دس احکاماتِ عشرہ حضرت موسیٰؑ کو دیئے گئے جن میں سے ایک یہ حکم تھا کہ اللہ کے سوا کسی کو بھی اپنا معبود نہ بنالینا۔ یہودی یومِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور اس بات پر بھی اُن کا پختہ یقین ہے کہ اِس کائنات نے ایک نہ ایک دن ختم ہو جانا ہے۔ عہد نامہ عتیق میں ہی یہودی مذہب میں صوفیانہ عناصر پائے جاتے تھے۔ یہودی مذہب کے اندر بھی خانقائی نظام موجود تھا لہذا طور پہاڑ کا پرندہ اپنے مذہب کی نمائندگی کے لئے باقی پرندوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ٹلہ جوگیاں پہاڑ کی چوٹی پر آتا ہے۔ طُور کا جُھلسا ہو پرندہ تصوراتی انداز میں موسیٰؑ سے شکایت کرتا ہے کہ میں بھی تمہاری طرح تجسس کا شکار رہا ہوں۔ میں بھی حق اور سچائی کی تلاش میں کبھی کوہ قاف پہاڑ کی طرف جاتا ہوں اور کبھی ٹلہ جوگیاں پہاڑ پر جاتا ہوں۔ میری بے چینی اُسی طرح برقرار ہے۔ اِن پرندوں میں ابنِ مریمؑ کا پرندہ بھی شامل تھا جو کہ عیسائیت کی ترجمانی کر رہا تھا۔ عیسائیت مذہب کے پیروکار اس وقت پُوری دُنیا میں زیادہ ہیں۔ عیسائی مذہب کے لوگ عقیدہ تثلیث پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔ عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں انجیلِ اربعہ، انجیلِ مرقس، انجیلِ متی، لوقا کی انجیل اور یُوحنا کی انجیل شامل ہیں۔ جہاں تک عیسائیت میں تصوف کا تعلق ہے تو عیسائی مذہب کا تصوف حقیقت میں ترکِ دُنیا سے تعلق رکھتا ہے اور اس مذہب میں خانقائی نظام موجود رہا ہے۔ تصوف اور روحانیت کی بنیادیں حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے ہی شروع ہو رہی ہے۔ اس مذہب کے لوگ حضرت عیسیٰؑ کو اپنی نجات کو ذریعہ مانتے ہیں جس طرح صوفیاء میں کامل مرشد کو

وسیلے کا ذریعہ مانا جاتا ہے۔ ابنِ مریمؑ کا پرندہ ایسا پرندہ تھا کہ جس نے اُس خون کی بوند سے جنم لیا تھا جو حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ سے نکلی تھی۔ یہ وہی پرندہ تھا کہ جو دریائے فرات سے پانی کی بوند اپنی جونچ میں لے کر آتا تھا اور حضرت عیسیٰؑ کے خشک ہونٹوں کو اُس پانی کی بوند سے تر کرتا تھا اور یہ وہی عیسیٰؑ تھے جو مردہ شخص کو زندہ کر دیتے تھے۔ جو ہر کسی کے دُکھ کا مداوا تھے۔ تیسرا الہامی مذہب اسلام ہے کہ جس میں صوفیانہ عناصر اور صوفیاء کرام کی زندگی کے احوال کا پتہ چلتا ہے۔ مذہب اسلام خود ایک امن وآشتی کا مذہب ہے اور اگر لفظ "اسلام" کے معنی پر توجہ دیں تو اس سے مراد ہی احکام کو بجالانا ہے۔ اس کے معنی "امن، صلاح، سلامتی بھی ہوسکتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کا پسندیدہ ترین مذہب اسلام ہے اور یہ حق وصداقت والا مذہب ہے۔ مذہب اسلام ایک کامل دین ہے یہ انسان کی ہر معاملات میں رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایسا مذہب ہے جو کہ انبیاؑ پر، فرشتوں پر، آخرت پر، الہامی کتابوں پر، اور عقیدہ ختمِ نبوت پر مکمل ایمان رکھنے ولا دین ہے۔ مذہب اسلام کائنات کا دوسرا بڑا مذہب ہے اور اس مذہب کے ماننے والے پوری دُنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہب اسلام میں تصوف کی بنیاد ہی "قرآن اور سُنت" ہے۔ اسلامی تصوف شریعت کا پابند ہے اور صوفیاء سے بھی یہ تقاضا کرتا ہے کے وہ شریعت کے پابند رہ کر تصوف کی پابندی کریں۔، مذہب اسلام میں تصوف کی تعلیمات یہ ہیں کہ ہر ایک کے ساتھ چاہے کوئی اسلام سے وابستہ ہو یا کے کوئی غیر مسلم ہو سب کے ساتھ محبت بھرا سلوک کیا جائے۔ بلا تفریق انسانیت سے دوستی اسلام کا شیوہ ہے۔ ناول منطق الطیر جدید میں اسلام کے حوالے سے جن صوفیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اُن میں خواجہ فرید الدین عطار، مولانا جلال الدین رومی، خاتونِ عجم قراۃ العین طاہرہ، منصور حلاّج، اور جنید بغدادی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ شخصیات ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگی کی تمام سہولتوں کو چُھوڑا اور راہ خُدا میں درویشانہ زندگی کو اپنا شعار بنایا۔ ان میں منصور حلاج جن کے بارے بعض علماء کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے کچھ کا خیال ہے کہ وہ "مرتد اور کافر" ہیں لیکن بقول مولانا رومی، فرید الدین عطارؒ اور امام احمد رضا خان بریلوی کے مطابق وہ مسلمان اور شہید تھے۔ منصور حلاج نے جس وقت انا الحق کا نعرہ لگایا تو اس جرم کی پاداش میں اُس کو سولی پر چڑھایا دیا گیا۔ قرۃ العین طاہرہ ایران کی مشہور شاعرہ جو شعیہ مسلک سے وابستہ تھی۔ حسن اور خوبصورتی میں اُس کا کوئی ثانی نہ تھا، جو کوئی دیکھ لیتا تھا اُسی کا دیوانہ ہو جاتا تھا۔ اُس نے بہاؤاللہ کے عشق میں اپنے آپ کو وقف کیا، بابی مذہب کو اپنایا اور اِسی مذہب کی مبلغہ بن کر گاؤں گاؤں، شہر شہر میں تبلیغ کرتی رہی۔ قرۃ العین نے بابی مذہب کے لگاؤ ہی میں اپنے سسر اور خاوند کے قتل کو جائز قرار دیا۔ مذہب اسلام کے پرندے نے غارِ حرا کے شگافوں میں جنم لیا۔ یہ وہ غار تھی کہ

جس کی روشنی پُوری کائنات میں پھیلی اور جس نے انسانوں کے دلوں کو منوّر کیا۔ منطق الطیر جدید ناول میں الہامی و غیر الہامی پرندوں کے ساتھ ساتھ زمینی پرندوں کا ذکر بھی کیا گیا کیونکہ ان کے بغیر تمام مذہبی پرندوں کا سفر بے کار ہے۔ لہذا اِن پرندوں کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ زمینی پرندوں کو ساتھ لے کر چلیں، ان کے بغیر وہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتے۔ زمینی پرندوں میں مرزا صاحباں، سوہنی مہنیوال، اور ہیر رانجھے کے پرندے شامل تھے۔ یہ پرندے بھی اپنی شناخت کے سلسلے میں پہاڑ ٹلہ جوگیاں آتے ہیں اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اِن زمینی پرندوں کا تعلق بھی کسی نہ کسی طرح اللہ ہی سے ہے۔ ناول کے آخر میں اس بات کو واضح کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کے اندر رب کا عشق سما جاتا ہے تو پھر اُن کے اندر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور جس سے اُن کی اپنی مرضی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ کے رنگ میں مست ہو جاتے ہیں اور سچائی کو پا لیتے ہیں۔ رب کی حقیقت سے وہ آشنا ہو جاتے ہیں۔

vi. نتائج

میری تحقیق سے جو نتائج سامنے آئے وہ یہ ہیں۔

۱۔ منطق الطیر بنیادی طور پر خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا تسلسل ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مستنصر حسین تارڑ فرید الدین عطار سے متاثر ہیں اور اُنہیں اپنا روحانی رہنما مانتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دونوں فن پاروں کے نام ایک جیسے ہیں، موضوعات میں مماثلت ہے، دونوں نے پرندوں کے ذریعے صوفیانہ عناصر کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔البتہ منطق الطیر جدید ناول ہے جبکہ عطار کی منطق الطیر مثنوی ہے۔

۲۔ منطق الطیر جدید میں غیر الہامی مذاہب، بدھ مت، ہندو مت اور سکھ مت کو بیان کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ نے گوتم بُدھ، گورکھ ناتھ، ہری بھرتری، جوگی پُورن اور گورونانک کے صوفیانہ پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔جن سے واضح ہوتا ہے کہ ان مذاہب میں اپنی ذات کی نفی، عملی زندگی سے کنارہ کشی، رہبانیت، حق اور نروان کی تلاش اور مختلف قسم کی ریاضتیں، مثلاً چلاّکشی، مراقبہ، دھیان گیان اور یوگا وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

۳۔ مستنصر حسین تارڑ نے ناول میں الہامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اوراسلام) میں پائے جانے والے صوفیانہ عناصر کو پرندوں کی مدد سے پیش کیا ہے۔وہ منطق الطیر جدید میں محبت اور عشق کی بات کرتے ہوئے مجاز سے عشق کا سفر کرواتے ہیں۔معرفت الٰہی، خیر و شر کی آویزش اور فقر و مستی کے بھید کھولتے ہیں۔

vii. سفارشات

۱۔ناول منطق الطیر جدید تاریخی حوالے سے ایک اہم ناول ہے۔اِس کی تاریخی تناظر میں تحقیق کی جاسکتی ہے کیونکہ اس ناول میں ایسے واقعات ہیں کہ جن کے ایک ایک لفظ کے ساتھ پُورا ایک تاریخی واقعہ جوڑا ہوا ہے۔

۲۔علامت نگاری کے حوالے سے بھی یہ ناول بہت اہم ہے اور اس نقطہ نظر سے بھی تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ناول میں سامی اور غیر سامی مذاہب کی تمام مذہبی روایات کو بیان کیا گیا ہے اس لئے اِن مذاہب کی روایات پر بھی تحقیقی و تنقیدی کام ہونا چاہیے۔

۴۔ناول منطق الطیر جدید کا اور ناول راجہ گدھ کا آپس میں تقابلی جائزہ ہونا چاہیے کیونکہ ان دونوں فن پاروں میں متصوفانہ صفات موجود ہیں۔

۵۔پاکستان کے قدیم تاریخی مقامات کا تذکرہ بھی ناول منطق الطیر جدید میں کیا گیا ہے لہذا اس حوالے سے تحقیق کافی اہمیت رکھتی ہے۔

کتابیات

(الف) بنیادی ماخذ

مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر جدید، ناول، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

(ب) ثانوی ماخذات

1۔ کتب

ابن حنیف، بھارت، بیکن بکس، ملتان س ن

ابو اسحٰق کلابازی، التعرف ص ۳۸ حقیقت تصوف، جلد اول، پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری، منہاج القرآن سنٹر لاہور، ستمبر ۱۹۹۰ء

ابوریحان البیرونی، کتاب الہند، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۷ء

ابو نصر سراج، کتاب اللمع، بحوالہ محمد شریف بقا، اقبال اور تصوف، جنگ پبلشرز، لاہور۔ ۱۹۹۱ء

اُردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد ۶ دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۱ء

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اُردو نثر میں طنز و مزاح، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۴ء

افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مضمون، مولوی نذیر احمد، مشمولہ، تاریخ ادبیات، مسلمانان پاکستان س ن

انتظار حسین، بستی، نقش اوّل کتاب گھر، لاہور، ۱۹۶۸۔

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور۔ س ن

بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

بشیر احمد صدیقی، نذیر احمد کی ناول نگاری، نقش اول کتاب گھر لاہور، ۲۰۱۲ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اُردو کی لغت، طبع سوم، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۸ء

جی۔ این۔ امجد، پروفیسر، گرونانک جی اور سکھ مت، مطبوعہ لاہور حکیم مطیع الرحمٰن نقشبندی، مترجم، حکایات س ن

حفیظ سیّد، ڈاکٹر، گوتم بُدھ سوانح حیات و تعلیمات، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۲ء

خلیق احمد نظامی، پروفیسر، تاریخ مشائخ چشت، ادارہ ادبیات، دہلی، ۱۹۸۰ء

رابرٹ وین ڈی ویئر، مترجم یاسمین خالد، سکھ مت تاریخ، حیات و تعلیمات، فکر و فلسفہ، شاہد پبلیکیشنز، جوہر جی

سنٹر، ملتان روڈ، لاہور۔ س۔ن
رضا احمد، ڈاکٹر، اُردو ناول میں تصوف کی روایت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۲۰۱۴ء
سمنتھ ناتھ دت، سری کرشن، گوتم بُدھ اور دوسرے رہنما، خُدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۳ء
سید احمد دہلوی، مولوی، مرتب فرہنگ آصفیہ، جلد اول، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء
شیخ عبد القادر جیلانی، غنیتہ الطالبین، مترجم، شمس صدیقی، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء
شیخ فرید الدین عطارؒ، حضرت، تذکرۃ الاولیاء، ضیاالقرآن پبلی کیشنز، داتا گنج بخش روڈ، لاہور، مئی ۱۹۹۷ء
ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر، ڈاکٹر، تصوّف اور تصوراتِ صوفیہ، ٹیمپل روڈ، لاہور، پاکستان
عبد السلام، نگران، اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء
علی بن عثمان جلابیؒ، کشف المحجوب، مترجم، فصل الدین گوہر، ضیاالقران پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۰ء
عماد الحسن آزاد فاروقی، دُنیا کے بڑے مذاہب، ادارہ تاریخ و ثقافت اسلامیہ، لاہور
عمیرہ احمد، پیر کامل، فیروز سنز (پرائیوٹ لمیٹڈ)، لاہور، ۲۰۰۵ء
غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
غلام قادر لون، ڈاکٹر، مطالعہ تصوف، (قرآن و سنت کی روشنی میں) دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۰۳ء
فرزانہ سید، نقوش ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء
فرید الدین عطارؒ، منطق الطیر، ضیاالقرآن پبلی کیشنز، لاہور۔ اکتوبر ۲۰۰۴ء
فضل کریم فضلی، خون جگر ہونے تک، دبستان، کراچی، ۱۹۶۰ء
ماتھر، موہن لال، ہندوستانی فلسفہ، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۷ء
محمد اکرم رانا، پروفیسر، ڈاکٹر، بین الاقوامی مذاہب، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۹ء
محمد حسن، پروفیسر، دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر، اُردو اکادمی، دہلی، طبع اول ۱۹۸۹ء
محمد طاہر القادری، پروفیسر، ڈاکٹر، حقیقتِ تصوف، منہاج القران پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء
محمد طاہر القادری، پروفیسر، ڈاکٹر، منہاج الافکار، ۱۳۶۵ ایم ماڈل ٹاون، لاہور، جنوری ۱۹۹۰ء
محمد طاہر القادری، پروفیسر، ڈاکٹر، اسلام اور اہل کتاب، منہاج القران پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء
محمد یحییٰ خان، موم کی مریم، پرائم پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

مستنصر حسین تارڑ، ڈاکیا اور جولاہا" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء
مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
میاں منظور احمد، پروفیسر، تقابلِ ادیان و مذاہب، علمی بُک ہاوس، اُردو بازار لاہور، ۲۰۰۴ء
میکش اکبر آبادی، مسائل تصوف، بک ہوم لاہور، ۲۰۰۴ء
نارائن آر۔ کے، مہابھارت، ترجمہ نعیم احسن، نگارشات، ۱۹۹۹
نہرو، جواہر لعل، تلاش ہند، ادارہ تخلیقات، لاہور، س ن

انگریزی کُتب

A.J Arberry, the doctorine of sufis SH, Muhammad Ashraf, 1966

.Julain Baldick, Mystical Islam.Taurisparke paperback London, 2000

.Mahmud, SF concise history of indo-Pak, Oxford University Press, 2000,

William Stoddart, "Sufism" the Mystical Dotrines and the method of Ialam, Publisher, Bloomington, Indiana, 2006

2۔ رسائل و جرائد

رسالہ، دیانرائن نگم، زمانہ کانپور ۱۹۴۲، ۱۹۰۳ سے انتخاب، خُدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ، س۔ن
ماہنامہ، مراۃ العارفین انٹرنیشنل، چیف ایڈیٹر سلطان احمد علی، العارفین پبلی کیشنز، لاہور، جون ۲۰۱۹ء
ماہنامہ منہاج القرآن، چیف ایڈیٹر علی اکبر قادری الازہری، منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۳ء

3۔ لغات

سید قائم رضا نسیم امروہی، سید مرتضی حسین فاضل لکھنوی (اُردو مترجمین) نسیم الغات، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س۔ن
سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جامع اُردو لغت، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، پاکستان، ۲۰۱۴ء
فیروز الدین مولوی، مرتبہ و مولفہ فیروز الغات، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۱ء
محمد عبداللہ خان خویشگی مرتبہ فرہنگ عامرہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
نور الغات نیا ایڈیشن (جلد چہارم) نیشنل بک فاونڈیشن لاہور ۱۹۸۵
وارث سرہندی، فاموس مترادفات، اُردو سائنس بورڈ اپر مال لاہور، ۱۹۸۶ء